حریفِ جاں

صباحت رفیق

نوٹ: حریفِ جاں پاک سوسائٹی کے لئے لکھی گئی خصوصی تحریر ہے۔

نہ حریفِ جاں، نہ شریکِ غم، شبِ انتظار کوئی تو ہو
کسے بزمِ شوق میں لائیں ہم، دلِ بے قرار کوئی تو ہو
کسے زندگی عزیز اب، کسی آرزوئے شبِ طرب
مگر اے نگارِ وفا طلب، ترا اعتبار کوئی تو ہو
کہیں تارِ دامنِ گُل ملے تو یہ مان لیں کہ چمن کھلے
کہ نشانِ فصلِ بہار کا سرِ شاخسار کوئی تو ہو
یہ اُداس اُداس سے بام و در، یہ اُجاڑ اُجاڑ سی رہگزر
چلو ہم نہیں نہ سہی، مگر سرِ کوئے یار کوئی تو ہو
یہ سکونِ جاں کی گھڑی ڈھلے تو چراغِ دل ہی نہ بُجھ چلے
وہ بلا سے ہو غمِ عشق یا غمِ روزگار کوئی تو ہو
سرِ مقتلِ شبِ آرزو رہے کچھ تو عشق کی آبرو
جو نہیں عدو تو "فراز" تو کہ نصیب دار کوئی تو ہو

(احمد فراز)

☆☆☆☆☆☆☆☆

قارئین کے نام!

السلامُ علیکم۔۔۔

ایک عرصے بعد میرا دل کیا کہ میں ایک داستانِ محبت لکھوں۔ ایسی داستان جس میں صرف محبت کا ذکر ہو۔ خالص محبت پہ لکھی گئی داستان۔۔

لیکن یہ کیا اس داستانِ محبت کو لکھنے کے لیے سب سے پہلا لفظ جو میرے ذہن میں آیا وہ 'لا حُب لا' تھا۔ محبت کی نفی کرتا ہوا۔ نہیں محبت نہیں کی گردان کرتا ہوا۔

تو کیا ہوا؟

ہم انسان بھی تو ساری زندگی یہی کرتے ہیں۔ حقیقت میں ہم محبت نہیں کرتے ہم نفرت کرتے ہیں۔ اور ایسی سچی اور خالص نفرت کہ خود بھی اس آگ میں جلتے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی جلاتے رہتے ہیں۔

میں نے اکثر یہ الفاظ سُنے ہیں کہ

یار میرے سامنے اُس کا نام بھی مت لو۔۔۔

نفرت ہے مجھے اُس سے۔۔

اگر ایک قتل معاف ہوتا تو میں اس انسان کا کرتی وغیرہ وغیرہ۔

یعنی کہ نفرت کا اظہار کھُلے عام سُنا ہے لیکن محبت کا اظہار کبھی اتنی شدت سے کیا گیا نہیں سُنا۔

خیر چھوڑیئے یہاں بات ہو رہی تھی نفرت کی۔۔

مجھے کبھی کسی نے نہیں بتایا کہ جو لوگ اتنی شدت سے نفرت کرتے ہیں اُس نفرت کا انجام کیا ہوتا ہے؟

میں نے یہ سوال اپنے دل سے پوچھا ہے اب میرا دل ہی اس سوال کا جواب دے گا۔ اس لیے میں اس دفعہ اپنے قارئین کے لیے داستانِ نفرت لے کے آئی ہوں۔

جیسا کہ انسان تو خطا کار ہے۔ غلطیاں کرتا رہتا ہے کبھی چھوٹی اور بڑی۔ لیکن ہم انسان بھی بہت عظیم ہیں ہم میں اتنا ظرف ہی نہیں کہ ہم ایک دوسرے کی غلطیاں معاف کر سکیں ۔ بجائے اس کے کیا کرتے ہیں ہم؟ کہ اپنے دل میں نفرت کا بیج بو لیتے ہیں اور پھر ہر وقت ایک دوسرے کی غلطیوں کو یاد کر کے دُہرا دُہرا کے اُس بیج کی ایسی آبیاری کرتے ہیں کہ اُس بیج سے ہمارے دل میں نفرت کا ایک ایسا تناور درخت بن جاتا ہے۔ جسے کاٹنے کی کوشش کرو بھی تو نہیں کٹتا۔ لیکن آپ نے یہ تو سُنا ہو گا کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ یہ بھی سُنا ہو گا کہ محبت کو نفرت کاٹ دیتی ہے۔

لیکن کیا کبھی یہ سوچا کہ نفرت کو کیا چیز کاٹتی ہے؟

اس سوال کا جواب تو آپ کو ناول پڑھ کے ہی ملے گا۔

اکثر جب ہم کوئی ناول پڑھتے ہیں تو یہی سوچتے ہیں کہ یہ تو بس ایک کہانی ہے حقیقت کا اس سے کیا لینا؟ لیکن کہانی حقیقت سے ہی اُٹھائی جاتی ہے۔ میں نے آج تک جتنے بھی دو چار لفظ لکھے ہیں وہ اپنے ارد گرد سے اُٹھائے ہیں آنکھوں دیکھے واقعات کانوں سُنی باتیں۔ اُنہیں اس طرح سے کہانی میں ڈھال دیا جاتا ہے کہ جسے دیکھ کے لکھا ہو اُسے بھی پڑھ کے گُماں نہ ہو کہ یہ اُس کی زندگی کی کہانی لکھ ڈالی ہے۔

مجھ سے اکثر میرے کلاس فیلوز اور جاننے والے پوچھتے ہیں کہ آپ ہمیں بتائیں کہ آپ نے اس کہانی میں کیا لکھا ہے؟ یقین مانیں میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہوتے مجھے خود نہیں پتہ ہوتا کہ میں نے کیا لکھا ہے؟

بس اس دفعہ بھی میں نے اپنے دل سے نکلے لفظوں کو کہانی کی شکل میں صفحہ قرطاس پہ بکھیر کے آپ کے روبرو کر دیا ہے۔

اب یہ تو آپ ہی بتائیں گے کہ میں نے کیا لکھا ہے۔۔۔

مجھے آپ کی تعریف یا تنقید دونوں کا انتظار رہے گا!

☆☆☆☆☆☆☆☆

پہلا باب

وہ اُسے کہتا ہے
سُنو او پگلی۔۔۔!
کسی شب کی تنہائی میں
فُرصتوں کے لمحوں میں
اپنی آنکھوں کو بند کرنا
اپنا ہاتھ دل پہ رکھنا
اور پھر دھیرے سے
زیرِ لب میرا نام گُنگنانا
اور وہ پگلی۔۔۔!
فرصتوں کے لمحوں کا
انتظار بھی نہیں کرتی ہے
اُسی شب کی تنہائی میں
وہ ایسا ہی کرتی ہے
ہاتھ دل پہ رکھتی ہے
آنکھیں بند کرتی ہے
زیرِ لب اُس کا نام دُہراتی ہے
اور
پھر ڈر کے اپنا ہاتھ ہٹا لیتی ہے

لیکن پھر دوبارہ چُپکے سے

بار بار یہی عمل دُہراتی ہے

اُس حریفِ جان کا نام

جیسے ہی لبوں کو چھوتا ہے

دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے

وہ نفی میں گردن ہلاتی ہے

اور لا حُب لا کا ورد کرتی ہے

نجانے کیوں وہ

دل کی تیز دھڑکن سے ڈرتی ہے

نجانے کیوں وہ

محبت کے ہو جانے سے ڈرتی ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆

"مجھے تم سے نفرت ہے۔

ہاں نفرت ہے۔۔۔!"

ہواؤں میں رقص کرتی ان آوازوں نے سر اُٹھا کے اپنے اردگرد دیکھا۔چاروں طرف رات کا اندھیرا پوری طرح پھیل چکا ہے۔ہر سُو خاموشی کا عالم ہے۔آسمان پہ ستاروں کے درمیان چاند اپنی پوری آب و تاب سے براجمان ہے۔چاند کی شہزادی اپنا سفید قیمتی لباس سنبھالے چاند کے دھانے پہ آ کے بیٹھ گئی ہے۔دن کے ہنگاموں اور شور میں دب کے پلٹ جانے والی یہ آوازیں روزانہ عین اسی وقت ہواؤں میں رقص کرتیں دوبارہ اُس شخص کے کمرے کی کھڑکی پہ آ کے دستک دیا کرتیں۔پہلے پہل یہ کھڑکی نہیں کھُلا کرتی تھی وہ آوازیں پھر بھی کھڑکی کے کونوں میں سے اپنی جگہ بناتے کمرے میں چلی جاتیں۔ لیکن اب اُن آوازوں کی پہلی دستک پہ ہی وہ کھڑکی کھُل جایا کرتی۔ آج جب وہ آوازیں وہاں پہنچیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ کھڑکی دستک دینے سے پہلے ہی **کھُلی** ہوئی ہے۔اور وہ شخص آنکھیں بند کیے راکنگ چئیر پہ جھول رہا ہے۔اُس نے اپنی آنکھیں کھول دی ہیں شاید وہ آوازوں کی آمد سے باخبر ہے۔اُس کے آنکھیں کھولنے پر وہ آوازیں کمرے کے چاروں طرف گونجنے لگیں۔

"تم کیا سمجھتے ہو مجھے تم سے محبت ہے؟

محبت اور تم سے؟

نہیں کبھی نہیں۔۔۔۔

مجھے تم سے محبت ہو ہی نہیں سکتی۔

تم سے محبت ہو بھی تو کیسے؟

کیا تم اس قابل ہو کہ تم سے محبت کی جائے؟

نفرت ہے مجھے تم سے۔

ہاں نفرت۔۔۔۔

اتنی نفرت کہ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی

اتنی نفرت کہ جن راستوں سے تم گزرتے ہو میرا اُن راستوں کو دیکھنے کا بھی دل نہیں کرتا۔

اتنی نفرت کہ جس شہر کی ہواؤں میں تم سانس لیتے ہو مجھے اُس شہر کی ہواؤں میں سانس لینا بھی گوارا نہیں۔

میں اس دُنیا میں ہی نہیں رہنا چاہتی کیونکہ یہاں تم رہتے ہو۔

ہاں میں دور چلی جانا چاہتی ہوں بہت دور جہاں تمہارا سایہ تک نہ ہو۔

لیکن میں نہیں جاسکتی۔۔۔۔

کہ میرے پاؤں میرے اپنوں کی محبت کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔

اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم مر جاؤ۔

ہاں تم مر جاؤ۔۔۔

کیونکہ تمہیں مر ہی جانا چاہئیے۔

کاش۔۔۔تم مر جاؤ۔۔۔"

وہ شخص ان آوازوں کے جواب میں آج بھی کچھ نہیں بولا۔ایک لفظ بھی نہیں اُس نے کہا۔جیسے پہلے کبھی نہیں کہا تھا۔اُس کی یہی خاموشی تو اُسے اور تکلیف دیتی تھی۔یہی خاموشی تو اُس کی نفرت میں اور اضافہ کرتی تھی۔ لیکن وہ پھر بھی خاموش رہتا تھا۔۔۔اور روزانہ اسی وقت جب چاند اُس کی کھڑکی کے عین سامنے آتا تو چاند پہ بیٹھی شہزادی اُسے یوں خاموش بیٹھا ان آوازوں کو سُنتا دیکھ کے اُداس سی ہو جایا کرتی۔وہ چاہتی تھی کہ وہ بھی عام لوگوں کی طرح اپنے جذبات کا

اظہار کرے۔ لیکن آج تک اُس نے کبھی یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ اُسے ان آوازوں کو سُن کے غصہ آتا ہے یا تکلیف ہوتی ہے وہ اپنی حرکات سے یہ ظاہر کرتا تھا کہ اُسے فرق ہی نہیں پڑتا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اُس نے کچھ ظاہر نہیں کیا۔ چاند کی شہزادی جاننا چاہتی ہے کہ اُس شخص کے دل میں کیا ہے۔ وہ دوسرے لوگوں کی طرح اپنے احساس ظاہر کیوں نہیں کرتا۔ یہ آوازیں کیوں اُس کے در پہ آ کے دستک دیتی ہیں۔

لیکن آج بھی چاند کی شہزادی مایوس لوٹ گئی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

فواز، حمزہ اور علی تینوں دوست یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور ایک ساتھ قدم اُٹھاتے کلاس کی طرف بڑھنے لگے۔ ان تینوں دوستوں کی ملاقات چار سال پہلے اسی یونیورسٹی میں ہوئی تھی جہاں سے اُنہوں نے بی کام آنرز کیا تھا اور اب ایم کام کے لیے دوبارہ اسی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ اُن تینوں کا شمار کلاس کے بہترین طالب علموں میں ہوتا تھا۔ لیکن فواز اپنے اُساتذہ کا دل پسند طالب علم تھا۔ اُس نے نہ صرف اپنے والد کو بلکہ کبھی اُساتذہ کو بھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ ایک فرمانبردار طالب علم تھا۔ فواز نہ صرف نصابی سرگرمیوں میں بلکہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی ہمیشہ آگے رہتا۔ اُس کے ہوتے ہوئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ جیت کسی اور کا مقدر بن سکے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی غرور اُس کی شخصیت کا حصہ بن گیا تھا۔ مرد اگر خوبصورت ہو اور ساتھ میں دولت، تھوڑا سا غرور اور صنفِ مُخالف کی سمت سے بے نیازی کا عنصر بھی شامل ہو۔ پھر اُس حُسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ایسے لوگ کسی بھی جگہ ہوں کسی بھی محفل کا حصہ ہوں سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ بھی ایسا ہی تھا۔ وہ ہمیشہ خود کو ہی جیتتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔ اور آج تک ایسا کبھی ہوا بھی نہیں تھا کہ کسی نے اُسے ہرانے کی کوشش کی ہو۔

"ایکسکیوزمی؟"

خوبصورت نسوانی آواز پہ کلاس کی طرف بڑھتے اُن کے قدم بیک وقت تھمے تھے۔ یہ آواز اُن کے پیچھے سے آئی تھی اس لیے وہ تینوں پیچھے کی طرف پلٹ گئے۔ کالے پرنٹڈ سوٹ پہ کالا ہی دوپٹہ خوبصورتی سے سر پہ جمایا ہوا تھا۔ کالے رنگ میں اُس کا سفید چہرہ دمک رہا تھا۔ اُنہوں نے پچھلے چار سالوں سے اس لڑکی کو اس سے پہلے یونیورسٹی میں نہیں دیکھا تھا اس کا مطلب کہ حال ہی میں یہاں ایڈمیشن لیا گیا تھا۔ فواز نے غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ ذرا بھی گھبرائی ہوئی نظر نہیں آ رہی تھی۔ خوبصورت ہونے کے ساتھ اُس میں خاصی خود اعتمادی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ حیران ہوا۔ بندہ یا تو خوبصورت ہو جائے یا پھر خود اعتماد۔ کسی لڑکی میں بیک وقت یہ دونوں چیزیں کیسے ہو سکتی ہیں؟ یا شاید یہ حُسن کا ہی

کمال ہوتا ہے جو انسان کو خود اعتماد بھی بنا دیتا ہے۔

حمزہ نے پوچھا۔

"جی فرمایئے؟"

"کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ M.Com 1.5 Evening کی کلاسز کہاں ہو رہی ہیں؟"

حمزہ بتانے لگا تھا لیکن فواز کی رگِ شرارت پھڑکی۔

"اُن کی کلاسز تو نیو کیمپس میں ہو رہی ہیں آپ تو اولڈ کیمپس میں آ گئی ہیں۔ نیو کیمپس میں تھرڈ فلور پہ ایم کام کی کلاس ہو رہی ہے۔"

"اوکے تھینک یو۔"

وہ خاصی عجلت میں تھی اسی لیے جواب سُنتے ہی فوراً شکریہ ادا کر کے وہاں سے چل پڑی۔ علی نے فواز کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"یار تم نے جھوٹ کیوں بولا؟"

اُس نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"میرا دل کیا تھا تو بول دیا۔"

حمزہ نے کہا۔

"تمہیں پہلی دفعہ کوئی ایسی حرکت کرتے دیکھا ہے۔ لیکن آج کے دن تو اپنے دل کو روک لیتے۔ پہلی دفعہ کسی لڑکی سے مذاق کیا اور وہ بھی جب مذاق کرنے کا نہ ہی موقع تھا نہ ہی وقت۔ مجھے نہیں لگتا سر اشرف اُسے کلاس میں آنے دیں گے۔"

"اوکم آن یار۔ کلاس فیلو ہے اگر میں نے مذاق کر ہی لیا تو ایسی کون سی آفت آ گئی ہے؟ چلو کلاس میں چلیں یا تم لوگ چاہتے ہو اب سر ہمیں بھی دیر سے پہنچنے پر کلاس میں نہ داخل ہونے دیں؟"

☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ بہت جلدی میں تھی وہ ہمیشہ وقت سے پہلے کلاس میں موجود ہوتی تھی۔ اُس نے نیو کیمپس کی طرف قدم بڑھاتے اپنی کلائی پہ بندھی گھڑی پہ وقت دیکھا۔ پانچ بج کے تیس منٹ ہو چکے تھے اور اسی وقت اُس کی کلاس شروع ہونی تھی۔ نیو کیمپس تھرڈ فلور پہ جا کے ہر کمرہ چھان مارا لیکن وہاں سارے کلاس روم خالی تھے وہاں کوئی کلاس نہیں ہو رہی

تھی۔وہ نیچے آ گئی۔ یہ تو اُسے پتہ چل چکا تھا کہ اُسے فول بنایا گیا ہے اس لیے اب کسی طالب علم سے پوچھنے کی بجائے اُس نے ریسیپشن سے پوچھا تو پتہ چلا اُن کی کلاس تو اولڈ کیمپس میں ہی ہو رہی ہے۔اُس نے کلاس روم کا نمبر پوچھا اور جتنا تیز چل سکتی تھی اُتنا تیز چل کے وہ وہاں پہنچی۔ اللہ کا نام لے کے دروازہ کھولا۔

"کیا میں اندر آ جاؤں سر؟"

"کیوں؟"

"سر کلاس لینی ہے۔"

"کون سی کلاس لینی ہے؟"

سر کی بات پہ کلاس سے دبی دبی مُسکراہٹوں کی آواز گونجنے لگی۔

"سر ایم کام 1.5 ایوننگ کی۔"

"پورے پندرہ منٹ دیر سے پہنچی ہیں آپ۔اس لیے آپ جا سکتی ہیں۔ آپ اب نیکسٹ کلاس لیجئیے گا۔کیونکہ مجھے دیر سے آنے والے سٹوڈنٹس کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔"

اُس نے نظر اُٹھا کے کلاس کی طرف دیکھا۔اُس کی نظر فواز پہ جا ٹھہری جس کے چہرے پہ اس وقت مسکراہٹ تھی۔

"سر میں مانتی ہوں کہ میں دیر سے پہنچی ہوں لیکن کیا آپ مجھے اس کی وضاحت کا موقع دے سکتے ہیں پہلی اور آخری دفعہ؟"

ساری کلاس کو یہ تھا کہ سر "نہیں" کہتے کلاس سے نکل جانے کا بولیں گے۔ لیکن نجانے کیا سوچ کے سر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"سر میں ہمیشہ کلاس میں اپنے ٹیچرز کے آنے سے پہلے موجود ہوتی ہوں۔ اس وجہ سے نہیں کہ دیر سے آنے پہ وہ ڈانٹیں گے یا کلاس نہیں لینے دیں گے بلکہ اس وجہ سے کہ میرے خیال میں اگر یہ دیکھنا ہو کہ کوئی طالب علم اپنے اُستاد کی کتنی عزت کرتا ہے تو یہ دیکھیں کہ وہ روزانہ کلاس میں اپنے اُستاد کے آنے سے پہلے پہنچتا ہے یا بعد میں۔ اگر اپنے اُستاد کے آنے سے پہلے کلاس میں موجود ہو اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے اُستاد کی بہت عزت کرتا ہے۔ لیکن اگر اُستاد کے آنے کے بعد کلاس میں آئے تو میں سمجھتی ہوں کہ یہ اُستاد کی بے عزتی کے برابر ہے۔اور سر میں آج بھی آپ کے آنے سے پہلے کلاس میں موجود ہوتی اگر کچھ سٹوڈنٹس میرے ساتھ غلط بیانی نہ کرتے۔ سر مجھے کلاس روم کا نہیں پتہ تھا میں نے کچھ

سٹوڈنٹس سے پوچھا تو اُنہوں نے مجھے غلط معلومات دیں اور مجھے نیو کیمپس تھرڈ فلور پہ بھیج دیا کہ وہاں ایم کام کی کلاس ہو رہی ہے۔"

اُس کی بات سُننے کے بعد سر نے ایک تنبیہی نظر ساری کلاس پہ ڈال کے پوچھا۔

"کیا اس کلاس میں سے تھے وہ سٹوڈنٹس؟"

اُس نے ایک نظر گھُمائی اور اُسی لڑکے کو دیکھا جس کے چہرے سے اب مُسکراہٹ غائب تھی اُس نے سر کی طرف دیکھا اور کہا۔

"نہیں سر۔"

فواز کے ساتھ اُس کے باقی دوستوں نے چونک کے اُسے دیکھا تھا۔

"ٹھیک ہے آپ بیٹھ جائیں۔"

"شُکریہ سر۔"

وہ اعتماد سے قدم اُٹھاتی سیکنڈ رو میں ایک خالی کُرسی پہ بیٹھ گئی۔ اور پھر ڈھائی گھنٹے کی کلاس کے دوران پوچھے جانے والے ہر سوال کا اُس نے اعتماد اور روانی کے ساتھ جواب دیا تھا کہ سر اشرف جاتے وقت فواز کو مُخاطب کر کے یہ کہنا نہیں بھولے تھے۔

"فواز بیٹا آپ کے لیے پچھلے چار سالوں کی طرح اس دفعہ پہلی پوزیشن کا ٹائیٹل جیتنا خاصا مشکل ثابت ہو گا۔ کیونکہ اب آپ کو ہرانے آنیہ بیٹا آ گئی ہیں۔ اس لیے تیار رہنا۔""

سر کی بات سے گردن موڑ کے آنیہ نے مُسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا۔

اور وہ تو جیسے سر تا پاؤں سلگ اُٹھا تھا۔

کیا ایسا کبھی ہوا کہ فواز داؤد ہار جائے؟

کیا ایسا کبھی ہوا تھا کہ فواز داؤد کو کسی نے ہرایا ہو؟

اُس نے خود سے عہد کیا۔

اب وہ ایسا کبھی ہونے بھی نہیں دے گا۔

خود کو ہرائے جانے کا عزم اس لمحے اُسے فواز کی آنکھوں میں صاف دکھائی دیا تھا۔ لیکن شاید وہ یہ بھول رہا تھا کہ وہ بھی آنیہ اظفر ہے۔

وہ کلاس سے باہر نکل کے اپنے دوستوں کے ساتھ جا رہا تھا جب آنیہ نے اُس کے سامنے جا کے اُس کا راستہ روک لیا۔ چند سیکنڈ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھنے کے بعد بولی۔

"تم یہ مت سمجھنا کہ میں تم سے ڈر گئی تھی اس لیے تمہارا نام نہیں لیا۔ تمہارے جیسے لوگ تو ہمیشہ میری زندگی میں آتے رہے ہیں۔ لیکن یقین مانو اُنہیں میں نے کبھی راستے کے پتھروں سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ بلکہ ایسے پتھروں کو پاؤں کی ٹھوکر سے راستے سے ہٹانا مجھے خوب آتا ہے۔ تم نے پوری کوشش کی کہ میں کلاس نہ لے سکوں لیکن میں نے بھی کلاس لے کے دکھائی۔ میں نے کبھی اپنے ٹیچرز کے ساتھ بحث نہیں کی۔ اُنہوں نے کہا کلاس سے نکل جاؤ میں نے نکل جانا تھا اگر میں تمہارے چہرے پر کسی کو جان بوجھ کے ہرا دینے کے بعد آنے والی مُسکراہٹ نہ دیکھ لیتی تو۔ تمہاری وہ مُسکراہٹ دیکھ کے اُس لمحے مجھے تم سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔ میں تو تمہیں جانتی بھی نہیں ہوں ان فیکٹ میں نے اپنی پوری زندگی میں تمہیں آج پہلی دفعہ دیکھا ہے تو تمہارا میرے ساتھ ایسا رویہ میری سمجھ سے باہر ہے۔"

حمزہ نے فواز کی سائیڈ لیتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں آنیہ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ فواز نے بس ایک چھوٹا سا مذاق کیا تھا۔"

تیکھی نظروں سے اُن تینوں کو دیکھا۔

"چھوٹا سا مذاق؟ اور یہ ہوتا ہی کون تھا مجھ سے مذاق کرنے والا؟ مذاق کرنے کے لیے کسی سے رشتہ ہونا ضروری ہے۔ کیا میرا اس کے ساتھ کوئی ایسا رشتہ ہے کہ یہ مجھ سے مذاق کر سکے؟ جو بھی ہے جس وجہ سے بھی تم نے ایسا کیا لیکن میری ایک بات یاد رکھ لو میں یہاں پڑھنے آتی ہوں تم جیسے لوگوں سے اُلجھنے نہیں۔۔ نا ہی مجھے اس سب کی عادت ہے اس لیے اب میرے راستے میں آنے سے پہلے یہ ضرور یاد رکھنا کہ میں "آنیہ اظفر" ہوں۔ اور۔۔"

بات ادھوری چھوڑ کے وہ سانس لینے کے لیے رُکی۔

فواز کا دل کیا اس لڑکی کا دماغ ٹھکانے لگا دے ایک ذرا سی بات پہ یوں تماشہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کافی کلاس فیلوز رُک کے یہ سارا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ فواز نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مُٹھیاں بھینچ کے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے خود کو بولنے سے روکا۔

سانس لینے کے بعد وارننگ دیتی آنکھوں کیساتھ اُنگلی اُٹھا کے بولی۔

"اور آنیہ اظفر نے نہ ہی کسی سے ڈرنا سیکھا ہے اور نہ ہی ہارنا۔ یاد رکھنا یہ کہ تمہارے لیے اچھا رہے گا۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆

دروازے پہ دستک کی آواز سُن کے مسز اظفر جو کہ پیپر چیکنگ میں مصروف تھیں اپنے کام کو چھوڑ کے کمرے سے باہر نکل آئیں۔ کی ہول سے دیکھ کے دروازہ کھول دیا۔

وہ اندر داخل ہوتے ہی اُن سے لپٹ گئی۔

"آنی ہٹو پیچھے مجھے دروازہ تو بند کر لینے دو۔"

دروازہ بند کرنے کے بعد اُنہوں نے پوچھا۔

"ہاں تو اب بتاؤ کیسی رہی پہلی کلاس؟"

وہ اُن کے بازو کے ساتھ سر ٹکاتے اندر کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"ماما جان کلاس تو بہت اچھی رہی لیکن۔۔۔۔"

اُنہوں نے فکرمندی سے پوچھا۔

"لیکن کیا؟"

"ماما آپ کھانا لگائیں میں فریش ہو کے آتی ہوں کھانا کھانے کے بعد پھر آپ کو تفصیل سے بتاتی ہوں۔"

مسز اظفر نے اُس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"اچھا جاؤ فریش ہو کے آؤ میں کھانا لگاتی ہوں۔"

"اوکے ماما جان۔ میں ابھی آئی۔"

مسز اظفر نے جب تک کھانا لگایا تب تک وہ فریش ہو کے آ گئی۔ کھانا کھانے کے بعد اُنہیں ٹی وی لاؤنج میں بٹھا کے اُس نے پہلے برتن سمیٹے اور پھر دو چائے کے کپ بنا کے وہیں لے آئی۔ چائے پینے کے دوران اُس نے فواز کے بارے میں ساری بات بتا دی۔ جسے سُن کے وہ پریشان ہو گئیں۔

"آنی تمہیں اُس کے ساتھ ایسے بات نہیں کرنی چاہیئے تھی۔"

"کیوں ماما جان؟ اس طرح تو وہ سمجھتا کہ میں اُس سے ڈر گئی ہوں اور وہ مجھے اور تنگ کرتا۔"

"تب وہ صرف ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے تمہیں پریشان کرتا۔ لیکن اب وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"کچھ نہیں کرے گا ماما جان آپ ایسے ہی پریشان ہو رہی ہیں۔"

"آنی اب دوبارہ تم کسی سے بھی یوں بدتمیزی نہیں کرو گی۔ نظر انداز کر کے آگے بڑھنا سیکھو میری جان۔"

"ٹھیک ہے ماما آئیندہ سے میں کوشش کروں گی کہ نظر انداز کر سکوں۔"

کچھ دیر بعد وہ دونوں ماں بیٹی اپنے گھر کے چھوٹے سے لان میں چہل قدمی کر رہی تھیں جب آنیہ نے اُن سے پوچھا۔

"ماما جان کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟"

"تم سے میں ناراض ہو سکتی ہوں؟"

"تو پھر آپ یوں خاموش کیوں ہیں؟"

"بس ایسے ہی تم پہ غصہ ہے۔"

"ماما بولا تو ہے کہ آئندہ کوشش کروں گی کہ ایسے لوگوں کو اور اُن کی حرکتوں کو نظر انداز کر سکوں۔"

"اس بات سے نہیں۔"

"پھر کس بات سے؟"

"آنیہ میں نے بولا تھا کہ اگر تم پڑھنا چاہتی ہو تو جاب چھوڑ دو اور مارننگ میں اپلائے کرو۔ لیکن تم نے میری ایک بات نہیں سُنی اور ایوننگ میں اپلائے کر دیا۔ ٹائمنگ دیکھی ہے؟ رات کے نو بجے تم یونیورسٹی سے واپس آ رہی ہو۔ آج کل لاہور کے حالات ویسے ہی خراب ہیں اور سردیوں میں اتنی دُھند میں اس وقت اکیلی آیا کرو گی؟"

"اوہو ماما جان آپ خوامخواہ ہی پریشان ہو رہی ہیں۔ میں اکیلی کہاں ہوں؟ آپ نے سُنا نہیں جب آپ کے ساتھ کوئی نہیں ہوتا تب اللہ آپ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اُس سے مضبوط سہارا کوئی ہو سکتا ہے؟ اور آپ کب تک یوں میرے لیے محنت کرتی رہیں گی؟ کیا میرا فرض نہیں بنتا کہ میں آپ کا ہاتھ بٹاؤں؟ ماما میں نے حال ہی میں کالج میں جاب شروع کی ہے اچھی جاب ہے میں کیوں چھوڑ دیتی؟"

"آنیہ تم نہیں سمجھو گی۔ میرا دل بہت ڈرتا ہے۔ ہم دو اکیلی عورتیں جن کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔"

"ماما جان اللہ پہ یقین رکھیں آپ۔ ہمارے ساتھ اللہ ہے اُس کے علاوہ ہمیں کسی کی بھی ضرورت نہیں۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ کافی کے دو کپ تھامے مسٹر داؤد کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بیڈ پہ بیٹھے گود میں لیپ ٹاپ رکھے ضروری ای میلز دیکھنے میں مصروف تھے۔

"السلامُ علیکم بابا جان۔"

"وعلیکم السلام بابا کی جان۔ میں تمہیں ہی یاد کر رہا تھا۔ آؤ بیٹھو۔"

اُنہوں نے اپنی نظر کی عینک اُتار کے اور لیپ ٹاپ بند کر کے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اور سیدھے ہو کے اُس کی اپنے پاس بیٹھنے کی جگہ بنائی۔ اُس نے بیٹھ کے اُن کی کافی کا کپ اُنہیں تھمایا۔ اور وہ دونوں باپ بیٹا کافی پینے لگے۔ سونے سے پہلے مل کے کافی پینا اور سارے دن کی باتیں ایک دوسرے سے شئیر کرنا اُن کا معمول تھا۔

"کیسا رہا تمہارا ایم کام کی کلاسز کا پہلا دن؟"

کافی کا مگ لبوں سے لگائے اس سوال سے آج کے دن کی ساری تلخی جیسے کافی کے اس ایک گھونٹ میں بھر آئی ہو۔ بہت مشکل سے اُس نے وہ گھونٹ حلق سے اُتارا تھا۔

"اچھا رہا۔"

اُس کے جواب دینے کے بعد کافی دیر وہ خاموش رہے تو اُس نے ہی اُنہیں پکارا۔

"خیریت ہے بابا جان؟"

"بیٹا کب تک یوں اکیلے زندگی گزارتے رہیں گے ہم؟"

"کیا مطلب ہم اکیلے کب زندگی گزار رہے ہیں؟ میں ہوں آپ ہیں، سکینہ بُوا ہیں ڈرائیور، مالی اتنے سارے لوگ ہیں۔"

"کچھ تو شرم کر۔۔۔ سمجھ رہے ہو کہ باپ کو بے وقوف بنا لوگے؟"

انتہا کی معصومیت چہرے پہ طاری کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا کیا ہے میں نے؟"

"فیضی یار کچھ تو میری بوڑھی ہڈیوں پہ رحم کر۔"

"ایسے کیوں بات کر رہے ہیں۔ یہ تو بتائیں آخر میں نے کیا کیا ہے؟"

"یار مسئلہ ہی یہ ہے کہ تم کچھ کر نہیں رہے ہو؟"

"بابا جان اب آپ بات کو گھما رہے ہیں سیدھی طرح بتائیں نا کیا نہیں کر رہا میں۔"

"ارے یار کوئی عشق وشق ہوتا ہے کوئی محبت ہوتی ہے کوئی شادی ہوتی ہے۔"

"بابا جان آپ بھی نا۔۔۔۔"

"کیا بابا جان آپ بھی نا؟ تمہاری عمر کے لڑکوں کے اتنے چکر ہوتے ہیں کہ ماں باپ کو ہی ہاتھ جوڑ کے کہنا پڑتا او پُتر بس کر۔ لیکن ایک میرا بیٹا ہے جس کی کبھی مجھے شکایت ہی نہیں ملی۔"

اُن کی آخری بات پہ وہ مُسکرا دیا۔

"بابا جان اللہ کا شُکر ادا کرنا سیکھیں۔ جس نے آپ کو مجھ جیسی فرمانبردار اولاد سے نوازا ہے۔ لوگ تو میرے جیسی اولاد پانے کے لیے دُعائیں کرتے ہیں۔"

اُنھوں نے آگے بڑھ کے اُس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

"لوگ تیرے جیسی اولاد پانے کی دُعائیں کرتے ہیں۔ لیکن تیری ماں نے تو تجھے اس دنیا میں لانے کے لیے اپنی جان تجھ پہ قربان کر دی میری جان۔"

سات سالوں بعد خُدا نے اُن کی دُعائیں سُنی تھیں اور مسز داؤد کو ماں کے رُتبے پہ فائز کیا تھا۔ لیکن پیدائش کے وقت ڈاکٹرز کے لیے ماں اور بیٹے دونوں کی جان بچانا مشکل ہو گیا۔ مسٹر داؤد کی خواہش تھی کہ اُن کی بیوی کو بچا لیا جائے۔ لیکن مسز داؤد نے اپنی خواہش ظاہر کی کہ اُن کی بجائے اُن کے بیٹے کو بچایا جائے۔ اپنی بیوی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے مسٹر داؤد نے اپنی محبت کی نشانی کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھا۔ اُس کی پرورش میں اپنی طرف سے کہیں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ وہ اُس کے لیے ماں باپ، بہن بھائی، دوست سب کچھ تھے۔ اور فواز بھی اُن پہ اپنی جان چھڑکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں باپ بیٹوں میں دوستوں سے بھی زیادہ بے تکلفی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلے دن جب وہ یونیورسٹی میں آئی اور فواز سے سامنا ہوا تو فواز نے اُسے دیکھ کے بھی ایسے اگنور کر دیا جیسے جانتا تک ہی نہ ہو۔ آنیہ نے آگے جا کے اپنا فرضی کالر جھاڑتے خود کو داد دی۔

دیکھا میرا کمال۔۔۔

ڈر گیا بے چارہ انسان۔

ماما جان ایسے ہی مجھے ڈانٹ رہی تھیں۔ کوئی مجھے کچھ کہے گا مجھے یعنی آنیہ اظفر کو اور میں اُسے ایسے ہی جانے دوں گی؟ چلو خوشی کی بات یہ ہے کہ میری باتوں کو سمجھ گیا۔ اب میرے راستے میں آنے کی غلطی نہیں کرے گا۔

"یہ اکیلے اکیلے مُسکرایا جا رہا ہے؟ خیریت ہے؟"

آواز پہ اُس نے اپنے دائیں طرف گردن موڑ کے دیکھا۔ اُس کی کلاس فیلو نمرہ تھی جس کے ساتھ وہ کل بیٹھی تھی۔

"السلامُ علیکم۔ کیسی ہو نمرہ؟"

"میں تو ٹھیک ہوں۔ آپ اپنا بتاؤ؟"

"میں بھی ٹھیک ہوں اور دراصل اس وقت خوش بھی۔ بس اسی لیے مُسکرا رہی تھی۔"

"خوشی کی وجہ کیا ہے؟ مجھے بھی تو بتاؤ۔"

"چھوڑو اُسے۔۔ آپ نے یہیں سے بی کام کیا؟"

"نہیں میں نے ابھی یہاں ایڈمیشن لیا۔"

"Same here"

"تو مطلب آپ کی بھی یہاں ابھی کوئی دوست نہیں۔ تو کیا ہم دوست بن سکتے ہیں؟"

نمرہ نے اپنا ہاتھ آگے کیا جسے اُس نے خوش دلی سے تھام لیا۔

"ہاں کیوں نہیں۔"

"ویسے کل بہت بے خوفی سے بولی تھی تم۔ تمہاری یہی بات مجھے بہت پسند آئی تھی۔ کسی سے نہ ڈرنے والی۔ لیکن یار اُس انسان کے سامنے تو تمہیں یوں نہیں بولنا چاہئیے تھا؟"

"کیوں؟"

"اتنے ہینڈسم، اتنے خوبصورت انسان کے سامنے کوئی ایسے بولے گا تو دل تو دکھے گا نا۔"

نمرہ کی بات سُن کے آنیہ مُسکرا دی۔

"مذاق اچھے کر لیتی ہو نمرہ۔"

اُس کی بات سے نمرہ بھی مُسکرا دی۔

اور پھر نہ صرف آج کی بلکہ ہفتے کی باقی کلاسز بھی اُس نے بہت سکون سے لیں۔ اس ایک ایک لیکچر میں ہی ہر ٹیچر کی نظر میں وہ اپنی جگہ بنا چکی تھی کلاس کی بہترین طالبہ کی حیثیت سے۔ اُسے کلاس ٹیچرز نے جی آر بننے کے لیے کہا۔ وہ بہت خوشی سے بن جاتی اگر مقابل سی آر وہ انسان نہ ہوتا جو اُسے ذرا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اُسے دیکھ کے منہ کا ذائقہ عجیب ہو جاتا تھا۔ اس لیے اُس نے معذرت کر لی۔ آج ہفتے کی آخری کلاس تھی میم نے اُنہیں ساڑھے ساتھ بجے ہی فری کر دیا۔ جبکہ اُن دونوں کا پوائنٹ آٹھ بجے آنا تھا اس لیے وہ دونوں یونیورسٹی کے لان میں بیٹھ گئیں۔

رات ہے اکتوبر کی۔۔۔!

وقت ہے بعد نمازِ عشاء کا۔

یونیورسٹی میں راج ہے خاموشی کا۔

سر اوپر اُٹھاؤ تو سیدھا نظریں چاند سے جا ملتیں۔۔۔

کالے آسماں پر کہیں کہیں ٹمٹماتے ستارے توجہ کھینچ لیتے۔۔۔

اُن دونوں کی نظریں آسماں پہ ہی تھیں جب نمرہ نے کہا۔

"یار کتنا رومینٹک ماحول ہے نا۔۔۔"

آنیہ نے چونک کے اُسے دیکھا۔

"ہیں؟ رومینٹک؟ کہاں سے؟"

"یار قسم سے تم بہت ہی ان رومینٹک بندی ہو۔ دیکھو چاند اور ستارے دیکھ کے کوئی احساس نہیں جاگتا تمہارے اندر؟"

"احساس کیسا؟ بس اچھے لگتے ہیں مجھے۔ کیا یہ کافی نہیں؟"

"نہیں یار۔ انہیں دیکھ کے تو رومینٹک سی فیلینگز آتی ہیں۔ انسان کو پیار کرنے پر اکساتے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ ایسی ہی کوئی رات ہو اور ہمارا محبوب ہمارے ساتھ ہو۔ جس کے کندھے پہ سر ٹکا کے ان خوبصورت چاند ستاروں کو دیکھتے پیار بھری باتیں کریں اور۔۔۔"

آنیہ نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"حد ہے یار۔ بھلا ان چاند تاروں کا پیار محبت سے کیا تعلق؟"

"حد ہے یار یہ تو مجھے تمہیں کہنا چاہیئے۔ کیا تم ناولز نہیں پڑھتی؟ شاعری نہیں پڑھتی؟"

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

نمرہ نے افسوس سے سر ہلایا اور پھر کہنے لگی۔

"یار یہ چاند تارے ہی تو ہیں جو شاعروں سے شاعری کرواتے ہیں۔۔۔

رائٹرز سے لو سٹوری لکھواتے ہیں۔۔۔۔

اور پیار کرنے والوں کو صدیوں تک پیار کرنے پر اکساتے ہیں۔۔۔۔

یہ سب چھوڑو اپنے پیار کا اظہار کرنے کے لیے پیار کی شدت بتانے کے لیے بھی انہی چاند تاروں کو توڑ لانے کے وعدے کیے جاتے ہیں۔"

"ہاں بچپن سے یہی گھسے پٹے ڈائیلاگ ہی سُننے کو ملتے ہیں۔"

"توبہ ہے آنی یار۔ تم بھی نا اچھے بھلے رومینٹک موڈ کا ستیاناس کرنے میں کمال رکھتی ہو۔"

وہ دونوں خاموش ہو گئیں۔

آنیہ نے موبائل کی سکرین روشن کرتے وقت دیکھا اور اُکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

""کیا یار یہ وقت بھی نہیں گزرتا۔ ابھی بھی پندرہ منٹ رہتے ہیں۔"

"میں تو سوچ رہی ہوں فواز ہی نظر آ جائے یار۔ کلاس میں تو اُسے دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔"

نمرہ کی بات سے آنیہ نے ایسے اُس کی طرف دیکھا جیسے اُسے سُننے میں غلطی ہوئی ہو۔ لیکن نمرہ مُسکرا دی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ یار کیا بندہ ہے وہ۔ کیا اُس کی پرسنیلیٹی ہے۔ ساتھ اُس کا ایٹی ٹیوڈ۔ نظروں سے قتل کر ڈالے اگلے انسان کو۔ قسم سے جس کی آنکھوں میں وہ ایک نگاہ ہی ڈال لے سمجھو وہ تو گیا۔ مجھے تو ایسے لڑکے بہت پسند ہیں ۔ میرا تو اُسے دیکھ کے ہی دل دھڑکنے لگتا ہے۔"

آنیہ کا تو یہ سُن کے ہی منہ کا ذائقہ تک کڑوا ہو گیا۔ اور مزید زہر تب گھُلا جب اُس نے سامنے سے فواز کو اپنے دونوں دوستوں کے ساتھ آتے دیکھا۔

نمرہ نے اُس کے کان میں سرگوشی کی۔

"واہ یار۔۔۔ دیکھو سچے جذبے کیسے رنگ لاتے ہیں میں نے اتنی شدت سے یاد کیا تھا کہ وہ میرے سامنے آ گیا۔"

"ایکسکیوزمی آپ لوگ اپنا فون نمبر اور ای میل ایڈریس دے دیجئیے۔ جی آر کے پاس انٹرنیٹ کا کچھ ایشو ہے اس لیے میم مجھے جو آرٹیکل بھیجیں گی میں وہ ساری کلاس کو میل کر کے آپ لوگوں کو انفارم کر دوں گا۔"

فواز نے یہ کہہ کے اپنا موبائل آگے کیا۔ نمرہ نے فوراً وہ لے کے اُس میں اپنا نمبر اور ای میل سیو کرنے کے بعد آنیہ کی طرف بڑھایا۔ بجائے موبائل تھامنے کے وہ کھڑی ہو گئی۔

"نمرہ سی آر کی طرف سے ملنے والے آرٹیکلز اور میسیجز تم ہی مجھے فارورڈ کر دینا۔ میرے خیال سے ہمارے پوائنٹ کا وقت ہو گیا ہے ہمیں چلنا چاہئیے۔"

اُس نے ایک نگاہِ غلط بھی اُس پر ڈالنا گوارا نہیں کیا تھا۔ اُس کی اس حرکت سے فواز کا خون کھول اُٹھا لیکن اُس نے خود پہ ضبط کرتے ہوئے "اوکے ایز یو وش۔" کہہ کے نمرہ سے موبائل لے لیا۔ تب آنیہ نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اُسی کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ پلٹتے وقت اُس کے قریب ہوا اور ایک گہری نظر اُس کی آنکھوں میں ڈالی کہ

آنیہ کا دل دھڑک اُٹھا۔ اُس کے پلٹنے کے بعد آنیہ کا ہاتھ بے ساختہ اپنے دل پہ گیا جو تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ تبھی اُس نے مڑ کے اُسے دیکھا اور مُسکرا کے وہاں سے چلا گیا۔ آنیہ نے اپنے چہرے پہ آنے والا پسینہ صاف کیا۔

اُس کی حالت سے بے نیاز نمرہ نے ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔

"یار اب یوں یہاں کیوں کھڑی ہو؟ چلو بھی پوائنٹ کا ٹائم ہو گیا ہے یہ نکل گیا تو اس کے بعد دوسرا آنا بھی نہیں ہے۔"

"ہاں چلو۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ شخص اندھیرے میں ڈوبے کمرے میں آنکھیں بند کیے راکنگ چیئر پہ جھول رہا ہے۔ اُس کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ آوازیں چار سُو رات کی سیاہی پھیلتے اور اُسے اکیلا بیٹھے دیکھ کے دندناتے ہوئے اُس کے کمرے میں آئی ہیں اور چاروں طرف بکھر گئی ہیں۔

اُس شخص نے اپنی آنکھیں کھول دی ہیں۔

"نفرت ہے مجھے تم سے۔

ہاں نفرت۔۔۔

اتنی نفرت تو تم بھی مجھ سے نہیں کرتے ہوگے جتنی نفرت میں تم سے کرتی ہوں۔

میں تو تم سے نفرت بھی نہیں کرنا چاہتی۔

میں تو تمہارا نام بھی یاد نہیں رکھنا چاہتی۔

میں جتنی مرضی کوشش کر لوں وہ لمحہ کبھی میرے ذہن سے نکلا ہی نہیں جب تم نے میرے چہرے پہ کالک ملنے کی کوشش کی تھی۔

میں اپنے چہرے پہ کالک ملنے والے پہلے ہاتھوں کو کیسے بھول جاؤں؟

میرا دل کرتا ہے میں تمہیں قتل کر دوں۔

اس دنیا سے تمہارا ناپاک وجود مٹا دوں۔

آخر میں نے ایسا کون سا جرم کر دیا تھا جس کی سزا تم نے مجھے دی ہے؟

لیکن میری بدقسمتی کہ ابھی میں ایک کمزور لڑکی ہوں جو تم جیسے فرعون کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

ابھی تم میری باتوں سے ہنستے ہو نا میری باتوں کو نظر انداز کر دیتے ہو۔ چُپ رہتے ہو۔ اُن کا کوئی جواب نہیں دیتے۔ کہ بھلا میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں تمہارا کیا بگاڑ سکتی ہوں۔

لیکن تم دیکھنا ایک وقت آئے گا جب میں اس قابل ہو جاؤں گی کہ میں تم سے انتقام لے سکوں۔

اور انشاء اللہ میں لوں گی تم سے انتقام۔

اور اگر میں تم سے انتقام نہ لے سکی تو وقت تم سے انتقام لے گا۔

وقت کا لیا انتقام بہت بُرا ہوتا ہے۔

اتنا بُرا کہ تمہارا دل کرے گا کہ تم مر جاؤ۔

لیکن تب تم چاہنے کے باوجود بھی مر نہیں سکو گے۔

اور تب تم مجھے میری باتوں کا جواب دینا چاہو گے لیکن میں نہیں سُنوں گی۔

تب میں ہنسوں گی اور تم دھاڑیں مار مار کے روگے۔

ہاں تم روگے۔۔۔۔!"

☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ جب سے یونیورسٹی سے آئی تھی مسز اظفر کو وہ کچھ کھوئی کھوئی اور پریشان سی لگی۔ کھانا بھی اُس نے برائے نام ہی کھایا تھا۔

"آنی بیٹا کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"جی۔۔۔ نہیں۔۔۔ ماما جان شاید تھکاوٹ ہو گئی ہے۔ "

"میں نے تو ہزار دفعہ کہا ہے کہ جاب چھوڑ دو۔ لیکن تم میری سُنتی ہی کہاں ہو۔"

"ماما آپ تو یوں ہی پریشان ہو جاتی ہیں، میں کمرے میں جا رہی ہوں سونے، سو کے صبح اُٹھوں گی تو ایک دم فٹ ہوں گی۔ "

"رُکو ذرا یہ دودھ کا گلاس بھی لیتی جاؤ۔"

"وہ کیوں چائے کی جگہ آج دودھ کا گلاس؟"

مسز اظفر نے دودھ کا گلاس اُسے تھماتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ میں نہیں چاہتی کہ تم چائے پی کے اگلا ایک گھنٹہ مزید جاگتی رہو۔ دودھ پی کے چپ کر کے سو جانا۔"

"او کے ماما جان۔ شب بخیر۔"

"شب بخیر۔"

مسز اظفر گھر کی بتیاں بُجھانے لگیں جبکہ آنیہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ سونے کے لیے لیٹی تو کمرے میں حبس محسوس ہونے لگی۔ دم گھٹنے لگا۔ وہ فوراً اُٹھی چند منٹ پہلے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا دودھ کا گلاس ایک ہی گھونٹ میں پی لیا۔ پھر بھی بہتر محسوس نہ ہوا۔ کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ ہوا کا جھونکا اُس کے چہرے سے ٹکرایا تو ذرا سکون محسوس ہوا۔ چند لمحے کھڑکی کے وسط میں دونوں ہاتھ ٹکائے ہوا کو اپنے چہرے پہ محسوس کرتی رہی۔

لوگوں کو پہلی نظر میں محبت ہوتی ہے۔ اور اُسے پہلی ہی نظر میں اُس نسان سے نفرت ہوئی تھی۔ جب آنیہ اظفر کو سر نے کلاس سے نکلنے کا بولا تھا اور اُس لمحے اُس انسان کے چہرے پہ در آنے والی مُسکراہٹ اُسے زہر سے بھی بُری لگی تھی۔ کسی کو ہرا دینے والی مُسکراہٹ۔ اُسی لمحے اُس پہلی نگاہ میں ہی ناپسندیدگی کا جذبہ اُس کے وجود میں سرایت کر گیا تھا۔ نجانے اُس کی مُسکراہٹ اتنی بُری کیوں لگی تھی کہ اُس کا دل کیا تھا کہ وہ نہ صرف اُس کے لبوں کی مُسکراہٹ چھین لے بلکہ اُس کی آنکھوں کو بھی آگ لگا دے جو مُسکرا رہی تھیں۔ اور اُس نے جیت کے ایسا کیا بھی تھا۔ وہ جیتی ہی اُسے ہرانے کے لیے تھی۔ پھر جب کلاس کے بعد اُسے اچھی خاصی سُنائی تھیں اُس لمحے اُس کی آنکھوں سے جیسے آگ کے شُعلے نکل رہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی کے ابھی آنیہ اظفر کو بھُسم کر ڈالے گا۔ لیکن اُس کے بعد اُس کی خاموشی حیرت انگیز تھی۔ آنیہ کے خیال میں تو اُس کے اور فواز کے درمیان ایک جنگ کا آغاز ہو چُکا تھا۔ اور جنگ میں جو شخص خاموشی اختیار کر لے تو اس کا مطلب یا تو اُس نے شکست مان لی (اور وہ شکست ماننے والوں میں سے تو بالکل بھی نہیں ہے) یا تو پھر وہ اپنے دشمن کو یعنی اُسے شکست دینے کا کوئی مضبوط لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔

اس سوچ پہ آ کے اُس کے ذہن میں کلک ہوا۔

اوہ۔۔۔ تو آج کے دن جو اُس نے کیا مطلب وہ اُس کا یہی لائحہ عمل تھا؟

اُس کے کانوں میں نمرہ کے لفظ تازہ ہوئے۔

"قسم سے جس کی آنکھوں میں وہ ایک نگاہ ہی ڈال لے سمجھو وہ تو گیا۔"

یعنی وہ اپنی اس ادا سے خود بھی واقف ہے اسی لیے اُس نے وہ ایک نگاہ اُس پہ ڈالی۔ جس کے سبب اُس کا دل دھڑک اُٹھا۔ یوں بے قابو ہو گیا جیسے ابھی پسلیاں توڑ کے باہر آ جائے گا۔ جسے سنبھالنے کے لیے اُس نے اپنا ہاتھ جب دل پہ رکھا تو کیسے اُس نے مڑ کے جیت کی مُسکراہٹ اُس کی طرف اُچھالی تھی۔

یعنی کہ وہ آنیہ اظفر کو "محبت" سے شکست دینے کا ارادہ کر چکا ہے۔
اُس نے اپنے چہرے پہ آیا پسینہ اپنے ہاتھ سے صاف کیا اور اب کہ مدھم سی آواز میں یہ سرگوشی ہواؤں کے سپرد کی۔
"مسٹر فواز داؤد میں تمہیں تمہارے اس ارادے میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔"
اسی شہر میں چند میل دور اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے اُس شخص نے ہوا کی سرگوشی سُنی تو اُسے اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ جو اشارہ اُسے دے آیا ہے وہ اُسے سمجھ آ گیا ہے۔ اور پھر مُسکراتے ہوئے ایک مدھم سی سرگوشی اُس نے بھی ہوا کے سپرد کی ہے۔
"یہ تو وقت ہی بتائے گا مس آنیہ اظفر۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆

تین دن کا ویک اینڈ گزار کے وہ جب یونیورسٹی آ رہی تھی تو سارا راستہ یہ ہی دُعا مانگتی آئی۔
"اللہ کلاس سے باہر اُس شخص سے سامنا نہ ہو۔ میں اُس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ پلیز پلیز پلیز اللہ۔"
اور پھر مین گیٹ سے کلاس تک جاتے مجال ہے اُس نے زمین سے نظریں اُٹھائی ہوں۔ اور پھر ایسا ہی ہونے لگا اگر وہ اُسے کہیں نظر بھی آ جاتا تو وہ وہاں سے راستہ ہی بدل لیتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ دوبارہ اُس شخص کو اُس کی آنکھوں میں دیکھنے کا موقع ملے۔ دو ہفتے اسی طرح گزر گئے۔
وہ کلاس میں آئی تو وہاں صرف دو سے تین لڑکیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اُس نے وقت دیکھا۔ ابھی پانچ بجے تھے۔ کلاس شروع ہونے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ اُس کی کلاس فیلو ثانیہ نے اُس سے پوچھا۔
"آنیہ نوٹس لے لیے ہیں؟"
"نہیں۔ کونسے؟"
"تمہیں سی آر کا میسیج نہیں ملا؟ سر نے بولا ہے کہ چھ بجے کلاس ہو گی یعنی کہ مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد ہی۔ اور تب تک مین لائبریری سے نوٹس بھی لے آئیں۔"
تبھی اُسے نمرہ کا میسیج بھی مل گیا جس میں لکھا تھا کہ اُسے دیر ہو جائے گی اور وہ جا کے نوٹس لے آئے۔ مین لائبریری اُن کے ڈیپارٹمنٹ سے دس منٹ کے فاصلے پر تھی۔ وہ جلدی سے گئی اور نوٹس لینے کے بعد بجائے باہر کے راستے سے ہی واپس جانے کے اُن کے ڈیپارٹمنٹ تک آتے اندر کے راستے سے ہی وہ آنے لگی۔ جو کہ سُنسان پڑا تھا۔

اُس نے سوچا فضول میں ہی وہ اس طرف آ گئی ہے۔

وہ روش پہ نظریں ٹکائے اپنے دھیان میں مگن چل رہی تھی۔ معاً اُس نے محسوس کیا کہ کوئی اور بھی اُس کے قدموں سے قدم ملا کے اُس کے ساتھ چل رہا ہے۔ کسی مانوس سے احساس کے تحت اُس نے نظریں اُٹھا کے اُس کی طرف دیکھا۔اور اُس کی نظریں ایک دفعہ پھر اُس کے دل کو دھڑکا گئی تھیں۔ لیکن اس دفعہ اُس نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھنے کی غلطی نہیں کی تھی بلکہ نظریں پھیرتے ہوئے تیز قدم اُٹھا کے چلنے لگی۔

"کتنے دنوں سے میں دیکھ رہا ہوں کیوں یوں مجھ سے گریزاں ہو؟ کیا تم میری آنکھوں میں دیکھنے سے ڈر رہی ہو؟"

آنیہ تو اُس کے اس محبت بھرے لہجے پہ ہی دنگ رہ گئی۔ بنا اُس کی طرف دیکھے پوچھا۔

"میں کیوں ڈروں گی؟"

"تم چاہے زبان سے اقرار نہ کرو لیکن تمہاری پلکوں کی ایک ایک جنبش بتا رہی ہے کہ تم ڈر رہی ہو۔ تم میری آنکھوں میں دیکھنے سے گُریزاں ہو۔"

اُس نے پنے لہجے کو مضبوط بناتے ہوئے کہا۔

"ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔"

"اگر ایسا نہیں ہے تو اپنے قدم روک کے ذرا میری طرف دیکھو۔"

اُس نے سوچا اگر وہ نہیں دیکھے گی تو وہ سمجھے گا وہ سچ میں اُس سے ڈر رہی ہے۔ اس لیے اُس نے اپنے قدم روک لیے اور پلٹ کے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔

توبہ کیسی آنکھیں تھیں اُس کی۔۔۔

جادو سے بھرپور، سحر زدہ کر دینے والی۔۔۔

اُس نے اپنی آنکھیں محبت کی قندیلیں جلا کے روشن کر رکھی تھیں۔۔۔

ان روشن چمکتی ہوئی سحر زدہ کر دینے والی آنکھوں میں مزید دیکھنے کی اُس میں تاب نہیں تھی۔ اپنی پانیوں سے بھر جانے والی نگاہیں اُس نے جھکا لیں۔

اس لمحے اُسے اپنی بے بسی پہ رونا آ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ شخص جان بوجھ کے محبت کا یہ کھیل کھیل رہا ہے۔ ورنہ جن آنکھوں میں وہ اپنے لیے نفرت دیکھ چکی تھی فقط چند دنوں میں اُن میں اُس کے لیے محبت کیسے پیدا ہو سکتی تھی؟ وہ جان بوجھ کے اُسے اپنی نظروں سے سحر زدہ کر رہا تھا کہ وہ چاہ کے بھی وہاں سے ہل نہیں پا رہی تھی۔ اُسے رونا آ رہا تھا

لیکن وہ اس شخص کے سامنے رونا بھی نہیں چاہتی تھی۔

"جانتی ہو آنیہ اظفر کہ تمہاری یہ آنکھیں کیا کہہ رہی ہیں؟

یہ کہہ رہی ہیں کہ وہ پل بھر میری آنکھوں کا تمہاری آنکھوں میں دیکھنا ان آنکھوں کو میرا اسیر بنا چکا ہے۔اُس پہلی نگاہ میں ہی محبت کا معصوم اور نرم و نازک جذبہ تمہارے دل کی تاروں کو چھیڑ گیا ہے۔ تمہارے دل کو یوں دھڑکا گیا تھا جس طرح صرف محبوب کی نگاہیں ہی دھڑکا سکتی ہیں۔ جس کے شور سے ڈر کے اُسے چُپ کروانے کے لیے تم نے اپنا ہاتھ اپنے دل پہ رکھا تھا۔ ایسی حالت تو صرف محبت میں ہی ہوتی ہے۔ تم کیوں خود سے بھی اس کا اعتراف کرنے سے گریزاں ہو؟

نہیں نہیں کی گردان سے اسے کیوں جھٹلا رہی ہو؟

کیوں۔۔۔؟

کیوں کر رہی ہو ایسا؟

تم اسے میرا رچایا ہوا کھیل کیوں سمجھ رہی ہو؟

جو پہلے دن ہوا اُسے بھول جاؤ آنیہ۔۔۔!

میری آنکھوں کی یہ محبت جو تمہارے دل کی تاروں کو چھیڑ رہی ہے اسے محسوس تو کرو۔

اسے خوابوں کے مختلف مدارج طے کرنے دو۔

کبھی

شبنم کی بوندوں کی طرح شب بھر ہوا میں تحلیل ہو جانے دو۔

کبھی

اسے نہ ختم ہونے والی سوچ کا حصہ بنا کے اپنی روح سے ہم کلام ہونے دو۔"

لفظ تھے یا کوئی جادو کا منتر؟

اُس کا دل کیا کہ وہ سب بھول کے ویسا ہی کرے جیسے وہ اُسے کہہ رہا ہے۔ اُس کا دل اُس کی باتوں میں بہکنے لگا۔

لیکن جلد ہی اُس نے اُسے سنبھالتے ہوئے کہا۔

"تم پتہ نہیں کیا کہہ رہے ہو۔ مجھے تمہاری باتوں کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ میں تمہارے اس کھیل میں نہیں آنے والی اس لیے دوبارہ اب یوں میرے راستے میں مت آنا۔"

وہ پلٹ گئی جب اُسے اُس کی آواز سُنائی دی۔

"آنیہ اظفر آخر کب تک مجھ سے بھاگو گی؟ کب تک تم میری محبت کو جھٹلاؤ گی؟ لیکن تم دیکھنا یہ جلد ہی تم سے اپنا آپ منوا لے گی۔ میں تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا۔ لیکن بہت جلد تمہاری آنکھیں ہر جگہ مجھے ہی ڈھونڈیں گی۔ اور تب تم خود میرے پاس آؤ گی۔"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ تیز قدم اُٹھاتی وہاں سے جانے لگی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

آغازِ نومبر ہے۔۔۔

موسمِ سرما کی آمد ہے۔۔۔

عجیب سا بوجھل پن طبیعت پہ چھایا ہے۔

خاموشی تو جیسے اُس کی روح میں سرایت کر گئی ہے۔

پڑھائی سے دل اچاٹ ہو گیا ہے۔

کبھی کبھی اُس کا دل کرتا کہ وہ اُس انسان کو جان سے ہی مار ڈالے۔ جب سے اُس کی زندگی میں آیا تھا۔ تب سے ہی کسی نہ کسی طرح اُسے پریشان کر رہا تھا۔ وہ اُس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اُس کے لیے بے پناہ نفرت دل میں پیدا ہوتی۔ لیکن عین اُسی وقت جب وہ نظر نہیں آتا تھا تو اُس کی آنکھیں مسلسل اُسے ڈھونڈتی رہتیں۔ دل میں اُسے دیکھنے کی خواہش اُبھرتی۔ اُسے لگتا وہ یہاں یونیورسٹی اب آتی ہی اُسے دیکھنے کے لیے ہے۔ اور جب وہ اُسے نظر نہ آتا اُس کا غصہ خود پہ نکالتی۔ دل کرتا کہ وہ انسان مر ہی جائے۔ گھر واپس جا کے رات کو سوتے وقت بستر میں چہرہ دیے آنسو تکیے کو بھگو دیتے۔ دل سے بے ساختہ دُعا نکلتی۔

اے اللہ وہ انسان مر جائے۔

میری زندگی سے دور کہیں دور چلا جائے۔

آج پورا ہفتہ ہو گیا تھا وہ اُسے نظر نہیں آیا تھا۔ کلاس ختم ہونے کے بعد اپنی بے چینی کے ہاتھوں مجبور وہ نمرہ سے پوچھ بیٹھی۔

"خیریت ہے؟ سی آر نہیں آ رہا؟"

نمرہ نے چونک کے اُسے دیکھا۔

"ہیں؟ یہ تم سے کس نے کہا؟"

"کسی نے نہیں کہا۔ میں نے پوچھا ہے۔"

"وہ تو روزانہ ہی آ رہا ہے۔ لیکن ہاں عین وقت پہ آتا ہے اس لیے بیک ڈور سے ہی آتا ہے اور کلاس ختم ہوتے ہی وہیں سے چلا بھی جاتا ہے۔ حمزہ بتا رہا تھا کہ آج کل وہ اپنی فیکٹری میں مصروف ہوتا ہے۔"

"تمہیں بڑی انفارمیشن ہے۔"

نمرہ نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے میں نہیں رکھوں گی تو پھر کون رکھے گا؟"

"ویسے خیریت ہے تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"ایسے ہی آج کل تم اُس کے حُسن کے قصیدے نہیں نا پڑھ رہی۔"

"ہائے یار کس دُکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا ہے۔ کتنی خوش قسمت ہوگی وہ لڑکی جس کا شوہر فواز داؤد ہوگا۔"

"خوش قسمت یا بد قسمت؟ انتہا کا چیپ انسان ہے۔"

نمرہ نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ سچ بول رہی ہوں۔ وہ پہلے دن مجھے غلط انفارمیشن کلاس کے بارے میں اسی انسان نے دی تھی۔ مجھے تو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا؟ ایسی خوبصورتی کا کیا کرنا؟ جس خوبصورتی میں انسان کا دل ہی کالا ہو۔ میں تو شکر کر رہی ہوں وہ آج کل دکھائی نہیں دے رہا۔ دن تو اچھے گزر رہے ہیں۔"

نمرہ کو اُس کا رویہ اور باتیں دونوں بُری لگی تھیں۔

"یار کوئی انسان جیسا بھی ہے تمہیں کوئی حق نہیں کسی کو بھی ایسا کہنے کا۔"

"اُسے حق ہے ہر کسی کو ذلیل کرنے کا؟"

"ایسا کون سا اُس نے کسی کو ذلیل کر دیا ہے جو تم ایسے بات کر رہی ہو؟ جو اُس نے تمہارے ساتھ کیا ایسے چھوٹے موٹے مذاق تو ہر یونیورسٹی اور کالج میں پہلے دن چلتے ہی رہتے ہیں۔"

"چھوڑو میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی۔ اُس کا نام تک نہیں لینا چاہتی۔"

"اوکے ٹھیک ہے مجھے آج بابا لینے آئے ہیں میں اُن کے ساتھ جاؤں گی۔ تم نے اگر جانا ہے تو آ جاؤ میں تمہیں ڈراپ کر دوں گی۔"

"نہیں اچھا نہیں لگتا۔ میں پوائنٹ سے ہی چلی جاؤں گی۔"

"اوکے ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔ میں جا رہی ہوں۔ اللہ حافظ۔"

نمرہ کے جانے کے بعد وہ کیفے میں جا کے بیٹھ گئی۔ جب پوائنٹ کے آنے میں دس منٹ رہ گئے تو وہ کیفے سے باہر آ گئی۔ اُس کے قدم باہر گیٹ کی طرف تھے۔ چلتے چلتے اچانک ہی کوئی احساس ہوا تھا جس سے گال تپ اُٹھے۔ دل دھڑک اُٹھا۔ پلکیں اُٹھا کے دیکھنے کی ہمت سلب ہو گئی۔ اُس کے ضمیر نے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

بھیگی لرزتی پلکیں؟

سرد کپکپاتے ہونٹ؟

سُرخ دہکتے گال؟

حال یوں بے حال؟

ذہن کی سکرین پر

ہیں سوچوں کے جو جالے

خیالوں کے تانے بانے

سب بیکار کے ہیں بہانے

نہ صرف دل و دماغ

بلکہ جسم کی رگ رگ میں

اُس شخص کے لیے نفرت ہے

آنکھیں اُسے دیکھنے سے انکاری ہیں

چلو مان لیا کہ۔۔۔!

یہ باتیں سچی تمہاری ہیں

تو پھر تمہاری پلکوں کی یہ لرزش کیوں؟

ہونٹوں کی یہ کپکپاہٹ کیوں؟

گالوں کی یہ سُرخی کیوں؟

لبوں پر جب "لا حُب لا" کا ورد

تو پھر دل کی یہ دھڑکن تیز کیوں ؟

ساتھ چلتے نفرت کے قابل شخص کی

موجودگی کا یہ ایسا "احساس" کیوں ؟

بتاؤ آنیہ اظفر پھر یہ سب کیوں ؟

تمہیں تو اُس سے نفرت ہے نا؟

نفرت میں تو انسان اپنے دُشمن کو نظر انداز کرنے میں کمال کی مہارت رکھتا ہے۔

سامنے ہو بھی تو یوں ظاہر کرتا ہے جیسے وہ انسان سامنے موجود ہی نہیں۔

ساتھ چل رہا ہو تو ایسے ظاہر کرتا ہے جیسے اُسے اُس کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوا۔

لیکن یہ کیسی نفرت ہے تمہاری؟

جو اُس انسان کی چند محبت بھری نظروں سے ہی ہار رہی ہے۔

تم نے کب سے ہارنا سیکھ لیا آنیہ اظفر؟

ضمیر کی اس آواز پہ اُس نے خود کو مضبوط بناتے ہوئے سوچا۔

"نہیں میں نہیں ہاروں گی۔"

اور اپنے قدموں کی رفتار تیز کرتے اُس شخص سے آگے نکل کے جلدی سے اپنے پوائنٹ پہ چڑھ گئی۔

پیچھے سڑک پہ کھڑے اُس شخص نے سوچا۔

"میری نظروں کے سحر سے نکلنا اتنا آسان کام نہیں ہے مس آنیہ اظفر۔ بہت جلد تم میری محبت کے سامنے گھٹنے ٹیک دو گی۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆

مسٹر داؤد ابھی ناشتہ کرنے ہی لگے تھے جب اُنہوں نے فواز کو آتے اور ڈائننگ ٹیبل پر اپنے سامنے والی کُرسی کھینچ کے بیٹھتے دیکھا۔

"گڈ مارننگ بابا جان۔"

اور پھر سکینہ بُوا کو آواز دیتے ہوئے کہا۔

"سکینہ بُوا میرے لیے بھی ناشتہ لے آئیں۔"

"زہے نصیب آج میرے بیٹے نے نہ صرف باپ کو اپنا دیدار کروایا ہے بلکہ اُن کے ساتھ بیٹھ کے ناشتہ کرنے کی سعادت بھی بخشی ہے۔"

اُن کی بات پہ وہ قہقہہ لگا بیٹھا۔

"بابا جان آپ بھی نا میری ٹانگ کھینچنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔"

"تو اور کیا کروں؟ سچ ہی تو کہہ رہا ہوں۔"

"یہ سارا ہفتہ ذرا مصروف رہا ہوں ورنہ ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ کو اپنا دیدار نہ کرواؤں؟"

"وہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ ایسی کون سی مصروفیت تھی جو باپ کے اُٹھنے سے پہلے تم گھر سے جا چکے ہوتے تھے اور باپ کے سونے کے بعد گھر آتے تھے۔"

"آپ کو اگر یاد ہو تو آپ نے اپنی ایک فیکٹری کا چارج میرے حوالے کیا ہوا ہے جو کہ میں نے آپ کے قابلِ بھروسہ مینیجر کے ہاتھوں دی ہوئی تھی۔ ایک ہفتہ پہلے کسی کام سے فیکٹری چکر لگا تھا۔ مجھے اکاؤنٹس میں کچھ گڑبڑ محسوس ہوئی۔ بس پھر اگلے دن سے میں اپنی ڈیوٹی پر تھا۔ ایک ایک چیز کی رسید منگوا کے دیکھی۔ کتنا مٹیریل آیا کہاں استعمال ہوا وغیرہ وغیرہ۔ اور جن پر مجھے شک گزرا میں نے اُنہیں جاب سے فائر کر دیا اور اُن کی جگہ کچھ نئے لوگوں کو ہائر کر لیا ہے۔"

مسٹر داؤد نے حیرت سے پوچھا۔

"تو کیا یونیورسٹی نہیں جاتے تھے؟"

"جاتا تھا نا فیکٹری سے پانچ بجے نکلتا تھا ساڑھے پانچ بجے کلاس میں ہوتا تھا۔ کلاس ختم ہوتے ہی دوستوں کے ساتھ ہاسٹل۔ کھانا وغیرہ کھا کے دو سے تین گھنٹے گروپ سٹڈی۔ پھر جب بارہ ایک بجے گھر آتا تھا تو آپ سو رہے ہوتے تھے اس میں میرا کیا قصور؟"

"نہیں برخوردار تمہارا کوئی قصور نہیں۔ ناشتہ کرو ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

اُس نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"جو حکم ابا حضور۔"

"تم نہیں کبھی سُدھر سکتے۔"

ناشتہ کرنے کے بعد وہ دونوں باپ بیٹا لان میں بیٹھے تھے۔

"یار تمہیں کیا ضرورت تھی خود پر اتنا بوجھ ڈالنے کی۔ مجھے کہتے میں دیکھ لیتا۔ تم آرام سے بس ابھی اپنی کلاسز لو۔ کل کو تم نے ہی سنبھالنا ہے سارا۔"

"تو کیا ہوا کوئی بوجھ نہیں مجھ پر۔ بلکہ آپ پر ڈبل بوجھ ہو جاتا اگر میں آپ کو کہتا۔ بلکہ اب تو میں نے سوچا ہے کہ میں روزانہ فیکٹری جایا کروں گا۔"

"ویسے خیر ہے نا بیٹا جی؟ یہ آج بات بات پہ بہت مُسکرایا جا رہا ہے۔"

"خیر ہی خیر ہے۔"

"لیکن لگ تو نہیں رہی۔"

"اس میں بھی میرا قصور؟"

"ٹال رہے ہو۔"

"بھلا آپ کو ٹال سکتا ہوں؟"

"پھر بتاؤ بات کیا ہے؟ کسی لڑکی وڑکی کا چکر تو نہیں؟ محبت تو نہیں ہو گی۔"

"کیا پتہ ہو گئی ہو۔"

"تو پھر میں شادی کی تیاریاں شروع کروں؟"

"اب اس عمر میں آپ شادی کرتے اچھے لگیں گے؟"

"میں اپنی نہیں تمہاری شادی کی بات کر رہا ہوں صاجزادے۔"

"میری شادی کی اتنی جلدی کیا ہے؟ ابھی تو میں پڑھ رہا ہوں۔"

"ہاں نرسری کلاس میں۔"

"اب ایسی بھی بات نہیں ہے بابا جان۔"

"تو پھر کیسی بات ہے؟ آخر کب تک مجھے ٹالتے رہو گے؟"

"جب تک ٹال سکا۔"

"یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔"

"مجھے ایسا نہیں لگتا۔"

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے کہ شادی نہیں کرو گے؟"

"شکر ہے آپ کو میری بات سمجھ میں آئی۔"

"وہ لڑکی کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟"

"کون سی لڑکی؟"

"جس سے تمہیں محبت ہو گئی ہے۔"

"مجھے خود نہیں پتہ۔"

"لیکن میں پتہ کروالوں گا۔ جب شادی ہی نہیں کرنی تو محبت کیوں کر رہے ہو؟"

اُن کے اس سوال پہ اُس نے نظریں چُراتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں۔"

مسٹر داؤد اُس پر ایک گہری نظر ڈال کے چُپ ہو گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اتوار کا دن تھا وہ آرام سے نیند پوری کر کے دس بجے کے بعد اُٹھی تھی۔ فریش ہو کے کمرے سے باہر نکلی تو مسز اظفر کو کہیں جانے کے لیے تیار دیکھا۔

"ماما کہیں جا رہی ہیں آپ؟"

اُنہوں نے چادر لپیٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہ میری دوست ہے نا فریحہ اُس کی ساس کا انتقال ہو گیا ہے وہیں جا رہی ہوں۔ میں نے ناشتہ بنا دیا ہے کر لینا۔ پہلے یہ دروازہ اچھی طرح بند کر لو۔ پوچھے بنا نہیں کھولنا۔ اگر کوئی جاننے والا ہوا تو پھر اندر آنے دینا۔ ورنہ وہیں سے پوچھ لینا کہ کیا کام ہے۔"

"اوہو ماما میں کوئی بچی تھوڑی ہوں جو آپ ابھی بھی باہر جاتے وقت مجھے یہ باتیں سمجھاتی ہیں۔"

وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔

"اولاد جتنی بھی بڑی ہو جائے ماں باپ کے لیے کبھی بڑی نہیں ہوتی۔ اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ ماما جان۔"

وہ دروازے کی کُنڈی لگا کے کچن میں آ گئی۔ ڈائننگ ٹیبل پہ اُس کا گرما گرم ناشتہ رکھا ہوا تھا۔ کُرسی کھینچ کے بیٹھ گئی۔ سکون سے ناشتہ کیا۔ پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ ارادہ تھا کہ کچھ پڑھ لے دسمبر کے دوسرے ہفتے سے مڈ ٹرم شروع ہو

رہے تھے۔ اور یہ نومبر کا آخری ہفتہ چل رہا تھا۔ گن کے چند دن رہ گئے تھے۔ پہلے ہی اُس شخص کی وجہ سے اُس کے کافی دن برباد ہو گئے تھے۔ یوں اُس کے حواسوں پہ چھایا رہتا تھا۔ کبھی کئی کئی دن وہ نظر نہیں آتا تھا اور جب وہ اُس کے حواسوں سے دور ہونے لگتا تو وہ پھر اُس کے سامنے آموجود ہوتا۔ اُس نے سوچوں سے پیچھا چھڑواتے ہوئے اپنا سٹڈی ٹیبل سیٹ کیا۔ ابھی پڑھنے کے لیے بیٹھی ہی تھی جب اُس کا موبائل بج اُٹھا۔ Un known نمبر سے کال تھی۔ اُس نے نہیں اٹینڈ کی۔ اُسی وقت میسیج بپ پہ اُس نے میسیج دیکھا۔ لکھا تھا کہ

"I am Fawaz Dawood. Please Aniya Azfar attend my call right now"

دوبارہ کال کی گئی اُس نے پھر نہیں اٹینڈ کی۔ اُس نے خود سے عہد کیا کہ اب وہ اُس کی باتوں کو نظر انداز کر دے گی۔

اگلا میسیج آیا۔

"Please Aniya."

پھر جب تیسری دفعہ کال کی گئی۔ اُس نے اٹینڈ کر لی۔

"ہیلو۔۔"

"السلامُ علیکم۔۔"

آنیہ نے سلام کا جواب دینے کی بجائے پوچھا۔

"کیوں کال کی ہے؟"

"یہ کیا انسان سلام کا جواب ہی دے دیتا۔ حال ہی پوچھ لیتا اگلے بندے کا۔"

"میں تمہیں کیوں سلام کا جواب دوں؟ جبکہ میں تم پہ سلامتی بھیجنا ہی نہیں چاہتی۔ اور تمہارا حال کیوں پوچھوں؟ جبکہ میں یہ بالکل بھی نہیں چاہتی کہ تمہارا حال اچھا ہو۔"

"کیا اتنی نفرت کرتی ہو مجھ سے؟"

"ہاں تمہاری سوچ سے بھی زیادہ۔"

"کیا تم وہ مذاق بھول نہیں سکتی؟"

"نہیں کبھی نہیں۔"

"اگر میں اُس کے لیے معافی مانگ لوں تو پھر بھی نہیں؟"

"اگر تم معافی مانگو گے تو بھی میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

"آخر کیوں ؟"

"کیوں کہ مسٹر فواز داؤد یہ بات تم بھی بہت اچھی طرح جانتے ہو اور میں بھی۔ یہ سارا تمہارا بہت سوچ سمجھ کے بچھایا گیا جال ہے۔ سو میں تو اس میں پھنسنے سے رہی۔ اس لیے بیکار میں اپنا وقت ضائع مت کرو۔"

"جال نہیں ہے آنیہ اظفر محبت ہے یہ میری۔ اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کے بتاؤ کیا تمہیں میری آنکھوں میں اپنے لیے کبھی محبت دکھائی نہیں دی ؟"

"یہ تو نہیں جانتی لیکن پہلے دن تمہاری نگاہوں میں اپنے لیے حسد اور نفرت مجھے ضرور دکھائی دیا تھا۔ تم خود ہی اب بتاؤ فواز داؤد جن آنکھوں میں میرے لیے نفرت ہو اُن آنکھوں میں میرے لیے محبت کیسے ہو سکتی ہے ؟"

"وہ نفرت نہیں تھی وہ بس وقتی غصہ تھا۔ کسی بھی انسان کی یوں سر راہ توہین کرو گی تو اُسے غصہ تو آئے گا ہی آنیہ۔ بس ویسے ہی مجھے بھی غصہ تھا لیکن یہ غصہ کب ختم ہوا اور کب تمہاری محبت نے میرے دل میں اپنے پنجے گاڑ دیے۔ مجھے خود بھی اس کی خبر نہیں ہے۔ لیکن میں بس اتنا جانتا ہوں آنیہ کہ میری راتیں تمہارے خیال کے سنگ کروٹیں لیتے گُزرنے لگی ہیں۔ میری صبحیں تمہاری سوچ کے سنگ گُزرنے لگی ہیں۔ تمہاری یاد مجھے کوئی کام نہیں کرنے دیتی۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم بن میرے سارے کام ادھورے ہیں۔ میری زندگی بھی ادھوری ہے۔ جب میری موجودگی میں تمہارے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اُسی طرح میرے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو جاتی ہے آنیہ۔ تب ہمارے دل ایک ہو جاتے ہیں۔ ہماری دھڑکنیں بھی ایک ہو جاتی ہیں۔ تب ہم دو نہیں رہتے تب ہم ایک ہو جاتے ہیں۔"

وہ کچھ نہیں بولی تھی بے حس و حرکت اُسے سُنتی رہی۔

"کبھی اپنا ہاتھ دل پہ رکھ کے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے زیرِ لب میرا نام گُنگنانا اور محسوس کرنا میرا نام لیتے ہی تمہارا دل کیسے دھڑکنے لگتا۔ شاید تب تمہیں محسوس ہو کہ میری محبت کوئی ڈرامہ نہیں ہے۔ نہ ہی سوچ سمجھ کے بچھایا جانے والا جال۔ اپنا خیال رکھنا آنیہ۔ اللہ حافظ۔"

اُس کے کال بند کر دینے کے بعد بھی وہ کئی لمحے یوں ہی موبائل کانوں سے لگائے بیٹھی رہی۔ پھر جب اُس کے آخری الفاظ دوبارہ کانوں میں گونجے تو اُس کا ہاتھ میکانکی انداز میں اُس کے دل کی طرف بڑھا۔ آنکھیں بند ہوئیں اور لبوں نے دھیرے سے اُس کا نام لیا۔ اور پھر اگلی ہی ساعت اُس نے ڈر کے ہاتھ ہٹا لیا۔ کیونکہ اُس کا نام لیتے ہی اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ اُس نے اسے اپنا وہم قرار دے دیا۔ لیکن جب دو سے تین مرتبہ دُہرانے سے بار بار ایسا ہی ہوا۔ تو وہ پریشانی سے اپنے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے نفی میں گردن ہلانے لگی۔

"نہیں اللہ۔۔۔ پلیز ایسا مت کیجیئے گا۔ اُس شخص سے نفرت قبول ہے لیکن محبت نہیں۔ پلیز اللہ۔۔۔ پلیز پلیز۔۔۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆

یونیورسٹی میں مڈٹرم کا آغاز ہونے میں فقط چند دن رہ گئے تھے۔ ہر کوئی اپنی ہر غیر نصابی سرگرمی بھول کے صرف پڑھنے میں مصروف نظر آتا۔ وہیں آنیہ اظفر جو پڑھائی سے تقریباً لاتعلق ہو چکی تھی۔ اُس نے نئے سرے سے خود کو مضبوط کیا۔ اپنے دل و دماغ کو یہ باور کروایا کہ اُسے ایم کام کرنے کے بعد کسی اچھے کالج یا یونیورسٹی میں لیکچرر شپ کرنی ہے۔ اپنی ماں کا سہارا بننا ہے۔ اس کے لیے اُسے ایم کام اچھے نمبروں سے پاس کرنے کی ضرورت ہے۔ بس وہ ایک ہفتہ اُس نے موبائل انٹرنیٹ سب کچھ بند کر کے دل لگا کے دن رات پڑھ کے مڈٹرم کے پیپر دیئے۔ اور اللہ نے اُس کے حوصلے، لگن اور محنت کو ضائع نہیں ہونے دیا تھا۔ جب پیپر دکھائے گئے تو آنیہ اظفر کے ساری کلاس میں سے زیادہ نمبر تھے۔ اس سے زیادہ خوشی اُسے یہ جان کر ہوئی کہ ہر سبجیکٹ میں اُس نے ایک ایک دو دو نمبروں سے فواز داؤد کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ آنیہ اظفر کو یقین تھا کہ اب اُس کا حسد سامنے آ جائے گا۔ اب وہ دیکھتی ہے کہ کیسے محبت کا ڈرامہ کر پائے گا۔ لیکن اُسے حیرت ہوئی جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو اُسے فواز کا یہ میسج ملا۔

"Congratulations to the most intelligent and beautiful girl for the highest marks "

اُس نے Thank U کا ریپلائے کیا ساتھ ہی اُس کی کال آ گئی۔

وہ اٹینڈ نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن پھر بھی اٹینڈ کر لی۔

"ہیلو۔"

اُس کا ہیلو سُنتے ہی فواز نے کہا۔

"مسلمان اپنی بات کا آغاز ہیلو سے نہیں السلامُ علیکم سے کرتے ہیں۔ السلامُ علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔"

"کیسی ہو؟"

"بہت اچھی۔"

"کیا کر رہی تھی؟"

وہ ایسے بات کر رہا تھا جیسے اُن میں بہت گہری دوستی ہو۔ اور وہ اس لیے آج اُس سے بات کر رہی تھی کہ وہ بہت

خوش تھی۔ خاموش مقابلے کو جیت جانے کی خوشی۔ فواز داؤد سے زیادہ نمبر لیے جانے کی خوشی۔

"کم از کم تم سے مبارکباد کی توقع نہیں کر رہی تھی۔"

"آہاں۔ وہ کیوں؟"

"اپنے حریف سے مبارکباد کی توقع تو کوئی بیوقوف ہی کر سکتا ہے۔"

"تمہیں کس نے کہا میں تمہارا حریف ہوں۔"

"کہنے کی کیا بات ہے تم ہو۔"

"پاگل ہی ہو۔"

"جی نہیں۔"

"یار نکل آؤ ان فضول سوچوں سے۔ دیکھو میں ایک شریف سا انسان ہوں ۔ میرا پچھلا سارا ریکارڈ صاف ہے۔ لڑکیوں سے صرف کلاس فیلوز کی حد تک بات کی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور تم کیسے مجھ پہ شک کر رہی ہو۔ کیا محبت کرنے کی سزا دے رہی ہو؟"

"میں کیوں کسی کو سزا دوں گی؟ اچھا چلو فرض کرو تمہاری محبت سچ بھی ہے تو میں کیا کروں؟ کیا میں نے کہا ہے کہ مجھ سے محبت کرو؟"

"تم نے کہا تو نہیں۔ لیکن ایک دن ضرور کہو گی۔"

"ہاہاہاہا Very Funny۔"

"اسے مذاق مت سمجھو آنیہ اظفر۔ میری یہ بات لکھ لو ایک دن تم مجھے ضرور کہو گی۔"

اُس کے سنجیدہ لہجے پہ اُس نے بھی سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"اتنا یقین ہے؟"

"ہاں بہت زیادہ۔"

"چلو دیکھتے ہیں۔"

"بالکل جناب دیکھ لینا۔ ویسے آج بہت خوش ہو؟"

"ہاں۔"

"کوئی خاص وجہ؟"

"ہاں خاص وجہ ہی ہے۔ لیکن میں بتانا نہیں چاہتی۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ۔"

آنیہ کو اُس کے یوں اچانک فون بند کر دینے پہ حیرت ہوئی۔ موبائل ہاتھ میں لیے اُس کی روشن سکرین کو دیکھتے ہوئے اُس نے یوں کندھے اُچکائے۔

"مجھے کیا۔"

اُس رات وہ بہت سکون کی نیند سوئی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اُس سے زیادہ نمبر لینے کی ایسی خوشی تھی کہ وہ یہ خوشی دوبارہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔ کلاس فیلوز کے درمیان تو ویسے ہی بہت **کمپیٹیشن** ہوتا اور وہ تو پھر اُس کا حریف تھا۔ وہ جانتی تھی اب مقابلہ سخت ہے۔ فواز اُس سے آگے نکلنے کے لیے دن رات ایک کر کے محنت کرے گا۔ اور اس بات کا یقین تب ہوا جب اُس نے آئندہ دنوں میں فواز کو اپنے کام سے کام رکھتے دیکھا۔ اب نہ کبھی اُس نے اُسے مخاطب کیا، نہ کبھی کوئی کال نہ ہی میسیج۔ جب کبھی سامنا ہو بھی جاتا تو یوں نظر انداز کر دیتا جیسے وہ اُسے جانتا ہی نہ ہو۔ کبھی کبھی تو اُسے اُس کے یوں دھوپ چھاؤں جیسے رویے پہ بہت حیرت ہوتی۔ کبھی وہ اس طرح ظاہر کرتا کہ وہ اُس کا بہت ہی اپنا ہے۔ اور اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے ابھی اُس کا دل اُس کی باتوں پہ ایمان لے آئے گا۔ اور کبھی وہ اجنبیوں سے بھی زیادہ اجنبی لگتا کہ اپنے اور اُس کے درمیان حریف کا رشتہ بھی محسوس نہ ہوتا۔ ان ہی دنوں اُسے دو سے چار بجے تک اکیڈمی میں پڑھانے کی آفر ہوئی۔ اور اُس نے مسز اظفر کے منع کرنے کے باوجود اکیڈمی جوائن کر لی۔ کالج سے اکیڈمی وہاں سے یونیورسٹی۔ رات کو گھر آتی کھانا کھاتے ہی سو جاتی۔ اور ویک اینڈ پڑھنے میں گزار دیتی۔ اور ان ہی دنوں میں اُسے اندازہ ہوا کہ فالتو سوچوں سے پیچھا چھڑوانے کا بہترین حل مصروفیت ہے۔ کب دو مہینوں کا وقت گزرا پتہ بھی نہ چلا اور اُن کے فائنل ٹرم آ گئے۔ اُس نے خوب دل لگا کے پیپر دیئے۔ ایک ہفتے کی چھٹیوں کے بعد سیکنڈ سمسٹر کی پہلی کلاس لینے کے لیے جب کلاس میں آئی تو دیکھا بہت کم کلاس فیلوز آئے ہوئے تھے۔ نمرہ بھی نہیں آئی تھی اور نہ ہی اُس نے بتایا تھا کہ وہ آج نہیں آئے گی۔ ورنہ وہ بھی آج آف ہی کر لیتی۔ کلاس لینے کے بعد وہ گیٹ سے نکل کے اپنے پوائنٹ کے سٹاپ کے راستے پہ اکیلی جا رہی تھی۔ جب ایک کار اُس کے قریب آ کے رُکی اور کسی نے دروازہ کھول کے تیزی سے اُسے اندر دھکیلا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ اُسے کہتا ہے

سُنو او پتھر دل لڑکی

ذرا نظر اُٹھا کے غور سے

میری طرف تو دیکھو

میری یہ بکھری ہوئی حالت بھی

تمہیں کوئی داستاں نہیں سناتی؟

یا تم یہ سب داستانیں،

سُن کے بھی ان سنا کر دیتی ہو؟

ذرا میرے لہجے پہ غور تو کرو

میری یہ سوز بھری آواز بھی

تمہاری رگوں میں کوئی

درد کا احساس نہیں اُتارتی؟

یا تم یہ سب درد،

محسوس کر کے بھی،

محسوس نہیں کرتی ہو؟

سُنو۔۔۔۔

کیا میری محبت کے

جذبوں کی تپش بھی

تمہارا دل نہیں دھڑکاتی؟

یا اس تپش سے

تمہارا دل دھڑکتا تو ہے

لیکن تم اُسے نہیں دھڑکاتی؟

☆☆☆☆☆☆☆☆

یوں اتنا اچانک اُسے اندر دھکیلا گیا تھا کہ ایک تو اس وقت وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا دوسرا رات کے وقت چلتی ٹریفک کے شور میں اس طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔ پہلے تو اُسے سمجھ ہی نہ آئی کہ ہوا کیا ہے۔ لیکن جب ذرا حواس بحال ہوئے تو دیکھا ڈرائیونگ سیٹ پہ فواز بیٹھا ہوا تھا۔ اور اُس کا بازو ابھی بھی اُس کے ہاتھ میں تھا۔ باہر نکلنے کے لیے اپنا بازو چھڑوانے کی کوشش کرتے اُسے سخت الفاظ کہنے کے لیے ابھی منہ کھولا ہی تھا جب فواز نے ملتجی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

'پلیز یار میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔'

آنیہ نے نظر اُٹھا کے بغور اُس کی طرف دیکھا۔

بڑھی ہوئی شیو، سلوٹ زدہ بلیک شرٹ، بکھرے بال۔

اُس نے اپنے بازو سے اُس کا ہاتھ ہٹایا اور سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔

فواز نے کار سٹارٹ کر دی۔

'اگر تم نے کوئی بات کرنی تھی تو ویسے ہی بول دیتے میں تمہاری بات سُن لیتی۔ لیکن تمہارا یہ طریقہ مجھے بالکل بھی پسند نہیں آیا۔'

'یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں۔ ورنہ تم بھی اچھی طرح یہ بات جانتی ہو۔ اگر میں کہتا تو تم انکار کر دیتی لیکن کبھی میرے ساتھ آنے کے لیے نہ مانتی۔'

آنیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ وہ سچ ہی کہہ رہا تھا۔

اُس نے دھیمے لہجے میں اُسے پکارا۔

'آنیہ۔۔۔؟'

'ہاں بولو۔ کیا کہنا ہے؟'

'میرے بابا جان سے ملو گی؟'

'کس لیے؟'

'ایسے ہی۔ میں اُنہیں تم سے ملوانا چاہتا ہوں۔ شاید پھر ہی تمہیں مجھ پہ یقین آ جائے۔'

'آخر تم مجھے کیوں یہ یقین دلانا چاہتے ہو؟'

'محبت کرتا ہوں تم سے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ پہ یقین کرو میری محبت کا جواب اپنی محبت سے دو۔'

اُس کی سوز بھری آواز، اُس کا مجنوں جیسا حلیہ دیکھ کے وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ کوئی ڈرامہ کر رہا ہے۔دل تھا کہ سب کچھ بھول کے اُس کی باتوں پہ ایمان لے آنے کے لیے بیتاب ہو رہا تھا۔لیکن انا کو یہ بات گوارا نہیں تھی۔

'اتنی پتھر دل مت بنو آنیہ۔میں نے دو مہینے یہی کوشش کی ہے کہ میرا تم سے سامنا نہ ہو۔جب بھی تمہاری طرف دیکھتا ہوں تمہاری نظروں میں اپنے لیے بیگانگی اور ناپسندیدگی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی آنیہ۔میری طرف دیکھو۔میری یہ بکھری ہوئی حالت بھی تمہیں کوئی داستان سُناتی محسوس نہیں ہو رہی؟مت کرو میرے ساتھ ایسے یار۔دیکھو تمہارے بغیر کیسے بکھر رہا ہوں۔'

'فواز۔۔۔'

آنیہ ابھی کچھ کہنے ہی لگی تھی جب اُس نے اپنا نام سُن کے ہی اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

'تمہارے لبوں پہ آ کے میرا نام معتبر ہو گیا ہے۔مجھے کبھی بھی اپنا نام سُننا اتنا حسین نہیں لگا جتنا اس وقت لگ رہا ہے۔کیا تم میری ایک چھوٹی سی خواہش پوری کرو گی آنیہ؟'

آنیہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

'ایک دفعہ پھر میرا نام لینا۔'

وہ کچھ نہ بولی رات کے اندھیرے میں سڑک پہ بھاگتی ٹریفک کو دیکھنے لگی۔

'پلیز آنیہ۔۔۔'

اُس کے التجائیہ لہجے پہ وہ اُس کا نام پُکارنے ہی لگی تھی۔جب دماغ نے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

واہ آنیہ واہ۔۔۔کہاں گیا تمہارا غرور؟کہاں گئیں وہ ساری باتیں کہ تم عام لڑکیوں کی طرح کبھی بھی لڑکوں کی باتوں پہ اعتبار نہیں کر سکتی۔لیکن تم بھی تو آج وہی کر رہی ہو۔تمہارا دل بھی تو عام لڑکیوں کی طرح ہی اُس کی ایک محبت کی نگاہ پہ ہی دھڑک اُٹھا تھا۔تم تو ثابت کر رہی ہو تم بہت کمزور سی لڑکی ہو۔اتنی کمزور کہ کوئی بھی تمہیں بے وقوف بنا سکتا ہے۔کوئی بھی اُسے جب مرضی توڑ سکتا ہے۔کیا پتہ یہی دیکھ کے فواز تمہیں توڑنے کی کوشش کر رہا ہو؟

اُس نے زیرِ لب 'یا اللہ' کہتے ہوئے سوچا وہ کیا کرنے جا رہی تھی۔اپنی آنکھیں بند کر کے کھولیں اور اپنا رُخ فواز کی طرف کر کے بولی۔

'گاڑی روکو۔'

'کیوں؟ آنیہ میں نے تم سے بس ایک چھوٹی سی خواہش پوری کرنے کا کہا ہے اور تم کار روکنے کی بات کر رہی ہو؟'
اُس نے کار روکے بنا پوچھا تھا۔

'ہاں کیونکہ میں تمہاری یہ فضول خواہشیں پوری نہیں کر سکتی۔ خُدا کے لیے میری جان چھوڑ دو۔

کیوں میری زندگی کا سکون تباہ کرنے پہ تُلے ہوئے ہو؟

آخر تم چاہتے ہی کیا ہو؟

ہزار دفعہ کہہ چکی ہوں اگر تم محبت کرتے ہو تو کرتے رہو۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟

مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہو؟

میں تو نہیں محبت کرتی نا۔۔؟

میں بھی انسان ہوں ہو سکتا ہے میری آنکھوں نے بھی کسی آئیڈیل شخص کے خواب بُنے ہوں۔ میں اپنے آئیڈیل شخص کو چھوڑ کے تم سے کیوں محبت کروں؟

عجیب ڈھیٹ انسان ہو۔

تمہاری کوئی عزتِ نفس بھی ہے یا نہیں؟

کتنی دفعہ کہہ چکی ہوں جان چھوڑ دو میری۔ دیکھو ادھر میری آنکھوں میں تمہارے لیے صرف ایک ہی جذبہ ہے اور وہ ہے—'ناپسندیدگی' کا۔ اور یہ بھی میں نے خود پیدا نہیں کیا۔ یہ تمہارا ہی پیدا کردہ ہے۔ میں اس جذبے کو ختم کرنے کی جتنی بھی کوشش کر لوں یہ ختم نہیں ہوتا کیونکہ تب ہی میری نگاہوں میں تمہاری وہ مُسکراہٹ دوڑ جاتی ہے جو اُس وقت تمہارے لبوں پہ ٹھہری تھی جب سر نے مجھے کلاس سے نکلنے کے لیے بولا تھا۔ ہو سکتا ہے تمہارے علاوہ اور بھی لوگ مُسکرائے ہوں لیکن مجھے آگ صرف تمہاری مُسکراہٹ سے لگی تھی۔

جانتے ہو کیوں؟

کیونکہ تمہارا مقصد ہی یہی تھا کہ سر مجھے کلاس سے باہر نکال دیں اسی لیے تو تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔

اور تم جانتے ہو مجھے یہ تمہاری محبت بہت کھوکھلی لگتی ہے۔ مانا کہ تمہاری نظروں کی تپش سے کئی بار میرا دل دھڑک اُٹھا ہے۔ لیکن وہ دل کا دھڑکنا صرف عارضی ہی ہوتا تھا۔ میری چھٹی حس مجھے بار بار احساس دلاتی ہے کہ تمہاری یہ محبت صرف مجھے میرے مقصد سے ہٹانے کے لیے ہے۔ کیونکہ تمہارے پچھلے سارے ریکارڈ کے مطابق اس یونیورسٹی میں گولڈ میڈل صرف تمہارا مقدر بنتا آیا ہے۔ لیکن اب تمہیں اپنی ہار صاف نظر آ رہی ہے اس لیے تم یہ سارا ڈرامہ کر

رہے ہو۔ لیکن یاد رکھنا میں بھی 'آنیہ اظفر' ہوں۔ میں نے کبھی کسی سے یہ ہار جیت کی جنگ کھیلی ہی نہیں۔ لیکن اگر کوئی مجھے ہرانے کی کوشش کرے گا تو ایسا تو میں کبھی ہونے نہیں دوں گی۔ تم دیکھنا جیت کو میں اپنا مقدر بناؤں گی۔ ابھی فرسٹ سمسٹر کا رزلٹ آنے دو پھر ہی دیکھ لینا۔ مجھ سے جیتنا آسان کام نہیں ہے۔ اس لیے یہ خیال اپنے دل سے نکال دو۔ یہ دیکھو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میری جان چھوڑ دو۔ میں اپنی ماں کے جینے کی وجہ ہوں۔ مجھے اپنی ماں کا سہارا بننا ہے۔ اس لیے خُدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔'

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اُس نے غور کیا کہ وہ کار روکے ہوئے تھا۔ اُس نے باہر نظر دوڑائی تو حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ جو ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا اُس کی نظریں سامنے سڑک پہ مرکوز تھیں۔ وہ اُس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اُس نے تو اُسے اپنے گھر کا ایڈریس بتایا ہی نہیں پھر اُسے کیسے پتہ چلا؟ لیکن بنا پوچھے ہی وہ جانے لگی۔ ابھی دروازہ کھولنے ہی لگی تھی جب فواز نے اُس کا ہاتھ تھاما۔ عین ممکن تھا کہ وہ اپنا دوسرا ہاتھ دروازے سے ہٹا کے اُس کے منہ پہ طمانچہ مار دیتی۔ ایسا کرنے کے لیے اُس نے ہاتھ بھی بلند کر لیا تھا۔ لیکن جب اُس کی طرف رُخ کیا ہی تھا کہ اُس کی نظریں اپنے ہاتھ پہ گرنے والے اُس گرم قطرے میں ہی گم ہو گئیں۔

اُس نے چونک کے سر اُٹھایا۔

وہ رو رہا تھا۔

اُس کا حریف رو رہا تھا۔

وہ اُس کا ہاتھ تھامے رو رہا تھا۔

وہ پلکیں بھی نہیں جھپک رہا تھا۔

وہ کچھ بول بھی نہیں رہا تھا۔

بس کھُلی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیال مادہ اُس کی آنکھوں سے نکل کے اُس کے ہاتھ پہ گر رہا تھا۔

اسی لمحے ہاں عین اسی لمحے اُسے لگا جیسے اُس کا دل کسی نے اپنی مُٹھی میں بھینچ لیا ہو۔

کسی کی آنکھوں میں آنسو اُس کی وجہ سے آئے تھے۔ وہ چاہے خود کو جتنا بھی مضبوط ظاہر کر لیتی۔ آخر ہے تو پھر نرم و نازک دل والی لڑکی ہی تھی نا۔

وہ تیزی سے اپنا ہاتھ چھڑواتے کار کا دروازہ کھول کے باہر نکل گئی۔ جب وہ گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ تب فواز وہاں سے ٹرن لے کے واپسی کے راستے پہ مُڑ گیا۔

مسز اظفر نے آنیہ کے اندر داخل ہو جانے پر جب گیٹ بند کر کے اُس کی طرف دیکھا۔ تو وہ ڈر سی گئیں۔
بجائے ہمیشہ کی طرح شور مچاتے اُن سے لپٹ کے اندر کی طرف جانے کے وہ ایک جگہ پہ ہی کھڑی تھی۔ اور جب نظریں اُس کے چہرے پہ گئیں تو دیکھا اُس کا رنگ فق ہوا تھا۔ اُن کا دل کسی انہونی کے احساس سے دھڑکا۔ اُنہوں نے اُسے بازوؤں سے تھام کے پوچھا۔

'آنی میری جان کیا ہوا ہے؟'

اُس نے اُن کی طرف دیکھا اور پھر اُن کے سینے میں منہ چھُپا کے دھاڑیں مار مار کے روئی۔ مسز اظفر بمشکل اُسے سنبھالتے اُس کے کمرے میں لے کے گئیں۔ اُسے پانی پلایا اور پھر اُس کے پاس بیٹھ کے اُس کے آنسو صاف کرنے کے بعد پوچھا۔

'میرا دل ہول رہا ہے آنیہ۔ خُدا کے لیے مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟ تمہاری آنکھوں میں یہ آنسو کس وجہ سے آئے ہیں؟'

پانی پی کے اُس کے ذرا حواس بحال ہوئے تھے۔ اب وہ اُن کو کیا بتاتی کہ
اُس کی آنکھوں میں آنے والے آنسو کسی کو رُلانے کی وجہ سے ہیں۔
کسی کا دل دُکھانے کی وجہ سے ہیں۔
محبت کے ہو جانے کے خدشے کی وجہ سے ہیں۔

'کچھ نہیں ہوا ماما۔ بس یونیورسٹی میں اچانک بلڈ پریشر لو ہو گیا تھا۔ مجھے آپ بہت یاد آ رہی تھیں۔ اس لیے آپ کو دیکھتے ہی رونے لگی۔'

'تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ ہزار دفعہ کہا ہے اپنا خیال رکھا کرو۔ دوپہر کو کچھ کھایا نہیں ہو گا۔ بی پی تو لو ہونا ہی تھا۔ میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔ کھا کے بس آرام سے سو جاؤ۔ اور صبح نہ ہی میں کالج جانے دوں گی نا ہی یونیورسٹی۔ سارا دن بس آرام کرو گی۔'

وہ خود بھی آرام کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اُن کی بات مانتے ہوئے کہا۔

'ٹھیک ہے ماما۔ نہیں جاؤں گی۔'

اور اُس کے کھانا کھاتے ہی مسز اظفر نے اُسے سونے کے لیے بھیج دیا۔ آنیہ اپنی ماں کو مطمئن کرنے کے لیے آنکھیں بند کر کے لیٹ تو گئی تھی۔ لیکن اُن کے جانے کے بعد وہ اُٹھ کے بیٹھ گئی۔ نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دور

تھی۔

اُسے نیند آ بھی کیسے سکتی تھی؟

اُس کی آنکھوں کے آنسو اُسے بار بار تکلیف دے رہے تھے۔ اُس نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا کسی کے آنسو اُسے اس قدر اذیت میں مبتلا کر سکتے ہیں۔

اُس کے ہاتھ پہ گرنے والے آنسوؤں نے وہاں جلن پیدا کر دی تھی۔ وہ دوسرے ہاتھ سے دائیں ہاتھ کی پُشت سہلا کے وہ جلن کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن وہ جلن کم ہونے کے بجائے اُس کے سارے وجود کا احاطہ کرنے لگی۔ ایک عجیب سی بے چینی نے اُسے اپنے حصار میں لے لیا۔ اُس کا دل کیا وہ فواز سے کال پہ بات کرے۔ اور ایسا کرنے کے لیے اُس نے فوراً موبائل نکال کے Contacts میں جا کے اُس کا نمبر نکالا۔ لیکن چاہنے کے باوجود بھی وہ نمبر نہیں ملا پائی تھی۔ وہ اُٹھی اور اپنا موبائل اپنے کمرے میں ہی چھوڑ کے مسز اظفر کے کمرے میں جا کے اُن کے ساتھ لیٹ کے سو گئی۔ کیونکہ وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بس سکون سے سو جانا چاہتی تھی۔ ایسی سکون بھری نیند تو صرف ماں کی آغوش میں ہی آ سکتی تھی نا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اُس کی آنکھ کھلی تو روشنی سے اُس کی آنکھیں چُندیا گئیں اُس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں اور اُٹھ کے بیٹھ گئی۔ اپنے اردگرد نظریں دوڑانے لگی پورے کمرے کی دیواروں پہ پینٹنگ بنی ہوئی تھی اونچے اونچے پہاڑ جن کو سبزے نے اور اونچے اونچے مختلف پھلوں اور پھولوں کے درختوں نے ڈھانپ رکھا تھا اور دائیں سائیڈ والی پینٹنگ میں ایک جھیل بھی بنی ہوئی تھی جس کے اوپر مختلف پھول ٹھہرے ہوئے تھے جبکہ بالکل سامنے والی دیوار کے درمیان میں ایک لکڑی کا شوکیس بنا ہوا تھا جس کے وسط میں آتش دان بنا ہوا تھا اور سائیڈوں پہ گلدان رکھے ہوئے تھے جس میں اصلی جنگلی پھول سجے تھے جن کی خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی اُس شوکیس کے دونوں طرف ایک ایک سفید رنگ کا صوفہ رکھا ہوا تھا اس نے گردن موڑ کے پیچھے کی طرف دیکھا تو دائیں، بائیں دو دروازے تھے اور درمیان میں ایک بیڈ تھا جس پہ وہ اس وقت بیٹھی ہوئی تھی سفید رنگ کی ہی بیڈ شیٹ اُس پہ بچھی ہوئی تھی اور بیڈ کے دونوں طرف شیشے کے گول ٹیبل رکھے ہوئے تھے وہ کچھ دیر تو اس کمرے کی خوبصورتی میں کھوئی رہی جو دیکھنے میں بالکل سادہ سا تھا لیکن پھر بھی کچھ تو تھا جو اُسے خاص بنا رہا تھا اُسے اب تک ایک خواب کا گُمان ہو رہا تھا۔

اچانک اس کے ذہن کی سکرین پہ وہ لمحہ روشن ہوا تھا جب وہ ہوسٹل سے نکل کے سڑک پار کرنے لگی تھی تو ایک

جیپ اُس کے بالکل پاس آ کے رُکی تھی اور کسی نے اُسے پکڑ کے اندر کھینچ لیا تھا اور اُسی وقت ایک نقاب پوش آدمی نے اُس کی ناک پہ رومال رکھا تھا۔

اُسے اغوا کر لیا گیا تھا۔۔۔۔

اس سوچ کے ساتھ ہی وہ بیڈ سے اُتری تھی۔ آنسو تواتر سے اُس کی آنکھوں سے بہنے لگے نجانے کون لوگ تھے اور کس مقصد کے لیے اُسے اغوا کیا گیا تھا۔

'اے اللہ میری عزت کی حفاظت کرنا'

بے اختیار ہی اُس نے اللہ کو پکارا تھا وہ لڑکھڑائی تھی سہارے کے لیے اُس نے دیوار پہ ہاتھ رکھا۔ تب اُسے محسوس ہوا کہ جسے وہ پینٹ ہوئی دیواریں سمجھ رہی تھی وہ درحقیقت گلاس وال تھی جس سے باہر کا منظر نظر آ رہا تھا مختلف پرندے ایک درخت سے دوسرے درخت پہ جا رہے تھے اور پہاڑوں سے پانی بہہ کے جھیل میں گر رہا تھا جس میں پھول حرکت کر رہے تھے اتنا حسین نظارا تھا کہ وہ ایک دفعہ پھر اپنی ساری پریشانیاں بھول گئی تھی اور باہر کے منظر میں کھو گئی۔

کھٹکے کی آواز کے ساتھ اُس نے پیچھے مُڑ کے دیکھا تو ایک بوڑھے سے بابا ٹیبل پر کھانے کی ٹرے رکھ رہے تھے ۔جب وہ ٹرے رکھ کے واپس جانے لگے۔تو وہ چیخی تھی۔

'مجھے کیوں اغوا کیا گیا ہے کیا قصور ہے میرا۔'

'مت رو بیٹی، جو قسمت میں لکھا ہو وہ ہو کے ہی رہتا ہے۔ اس میں کسی کا کوئی دوش نہیں ہوتا۔ جو ہوا اچھا نہیں ہوا۔ لیکن اللہ کے کام اللہ ہی جانے، اُس کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ ادھر آؤ بیٹا پہلے کچھ کھا لو باقی سوالوں کا جواب تب دوں گا جب تم کچھ کھاؤ گی۔'

بابا نے نیچے کارپٹ پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

کھانے کی ٹرے میں جوس، سُرخ رنگ کے سیب اور سُرخ رنگ کے انگوروں کے علاوہ بھُنا ہوا گوشت رکھا ہوا تھا اُس کی بھوک چمک اُٹھی تھی اور ساتھ وہ جلد سے جلد یہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ کونسی جگہ ہے اور اُسے کس مقصد کے لیے ادھر لایا گیا ہے اس لیے اُس نے ٹرے اُٹھالی اور بابا کے سامنے نیچے بیٹھنے لگی۔

'نہ بیٹی نا اوپر بیڈ پہ بیٹھو یہ نیچے تو ہم ملازموں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔'

وہ اُدھر ہی رُک گئی تھی اور بولی۔

'ملازم بھی تو انسان ہوتے ہیں نا بابا تو پھر ہم اُن کے ساتھ نیچے یا وہ ہمارے ساتھ اُوپر کیوں نہیں بیٹھ سکتے؟۔'

'بٹیا چھوٹے چوہدری صاحب کسی بھی وقت آ سکتے ہیں اس لیے تم اوپر ہی بیٹھو اگر اس طرح اُنہوں نے نیچے بیٹھے دیکھ لیا تو مجھ پہ غصہ ہوں گے۔'

وہ خاموشی سے بیڈ پہ بیٹھ گئی اور جلدی جلدی بھوک مٹانے لگی۔ پرندوں کا بُھنا ہوا گوشت اتنا لذیذ تھا کہ وہ اپنی زندگی میں ایسا ذائقہ دار گوشت پہلی دفعہ کھا رہی تھی۔ اُس نے سیر ہو کے کھایا تھا اور پھر کھانے کے بعد بولی۔

'بابا اب مجھے سب بتائیں یہ کونسی جگہ ہے اور مجھے ادھر کون لایا ہے۔'

بابا نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اُسے بتانے لگے۔

مغلیہ حکومت کے دور کا نواب اکبر شاہ کا بیٹا سلیم (شیخو بابا) ایک دن اپنے خادموں کو ساتھ لیے شکار کے لیے نکلا ہوا تھا شکار ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ ایسی جگہ پہنچ گئے جدھر ہر طرف پہاڑ ہی پہاڑ تھے اور اُن پہاڑوں کو سبزے نے اور اونچے اونچے درختوں نے ڈھانپ رکھا تھا جن میں مختلف پھلوں اور پھولوں کے درخت بھی شامل تھے جن پہ رنگ برنگے پرندے چہک رہے تھے۔ اس کے علاوہ اس جگہ پہ کسی انسان کا نام و نشان نہیں تھا نہ اُنہیں پرندوں کے علاوہ کوئی اور خطرناک جانور کا وجود دکھائی دیا جب وہ اس جگہ کے دامن میں پہنچے تو اُدھر ایک جھیل بنی ہوئی تھی اُنہوں نے سر اُٹھا کے جب اُوپر دیکھا تو بہت اونچائی سے پہاڑوں سے پانی بہتا ہوا اس جھیل میں گر رہا تھا وہ حیران تھے کہ اتنی خوبصورت جگہ اُنہوں نے پہلے کیوں نہیں دیکھی۔ بس پھر اُنہوں نے اس خوابوں کی وادی میں ایک عالیشان اور خوبصورت محل بنانے کا حکم جاری کر دیا اور چھ مہینوں میں مزدوروں کی ایک لمبی لائن نے اُن کے خیال کو حقیقت کا رنگ دے دیا اور جب شیخو بابا نے محل دیکھا تو اُس کو خواب محل کا نام دیا اور اُس پہ خواب محل کی تختی لگوا دی گئی اور اس طرح یہ جگہ خواب نگر کہلانے لگی جس کا صرف شیخو بابا کے قریبی دوستوں اور ملازموں کو علم تھا۔ وہ سال میں ایک دفعہ تو ضرور خواب نگر تنہائی میں وقت گُزارتے۔ ادھر اُنہوں نے اپنے خاص وفادار ملازم رکھ دیئے تھے جو اس کی دیکھ بھال کرتے۔ بعد ازاں ایک دفعہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ آئے تھے تو یہ وادی اپنے ایک دوست ظہیر الدین کو تحفہ کے طور پہ دے دی۔ اسی طرح اس کی ملکیت ظہیر الدین کی اگلی نسل تک منتقل ہوتی آئی یہ جگہ دن میں جتنی خوبصورت نظر آتی ہے رات کو اُتنی ہی بھیانک ہو جاتی ہے۔ مختلف پرندوں کی آوازیں، ہوا چلنے سے درختوں کی سائیں سائیں اور جھیل میں پانی گرنے کا شور، یہ سب مل کے اور زیادہ خوفناک بنا دیتے ہیں۔ اور اگر کوئی خواب نگر سے رات کے وقت باہر نکلے تو چاروں طرف چاند کی روشنی میں نظر آتے درختوں کے سائے ایک دفعہ تو دل میں خوف پیدا کر دیتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ جگہ ہمیشہ پُر اسرار ہی رہی اور صرف سیر کے لیے اس جگہ آیا جاتا۔ اب خواب نگر چوہدری حشمت علی نے اپنے بیٹے شاہ میر کو اٹھارہویں

سالگرہ پر گفٹ کر دیا تھا۔

شاہ میر پہلا انسان ہے جو پہلی دفعہ اٹھارہ سال کی عمر میں ادھر آیا تھا اور رات کے اندھیرے میں اس خوفناک جگہ سے گھبرا کے اگلے دن ادھر سے بھاگا نہیں تھا بلکہ وہ پورا مہینہ ادھر رہ کے گیا تھا اُس نے اپنے لیے دو اعلیٰ نسل کے گھوڑے منگوائے تھے۔ اور پھر وہ ہر سال ایک مہینہ کے لیے چھٹیوں میں ادھر آتا اور رات کی تاریکی میں خواب نگر گھوڑے دوڑاتا اور پھر خواب نگر کے باہر کے جنگل سے پرندوں کا شکار کر کے لاتا اور اگلے دن کے ناشتے میں اُسے وہ بھون کے پیش کیے جاتے۔ وہ سات سال سے ادھر آرہا ہے اُسے خواب نگر سے بہت محبت ہو گئی ہے وہ انسان جو اپنے گاؤں میں ظالم مشہور ہے جو انسانوں کی جان لینے سے بھی دریغ نہ کرے اُس نے خواب نگر کے پرندوں کو کیا کبھی پھولوں تک کو نہیں نقصان پہنچایا۔ چھوٹے چوہدری صاحب شباب اور شراب کی محفلوں میں وقت گُزارنے کے عادی ہیں لیکن وہ آج تک کسی لڑکی کو کیا اپنے دوست تک کو خواب نگر نہیں لائے۔ بیٹی ڈرائیور تمہیں صبح ادھر چھوڑ کے اُسی وقت نکل گیا تھا اب چھوٹے چوہدری صاحب آئیں گے تو پتہ چلے گا اُنہوں نے کیوں تمہیں اغوا کروایا ہے۔

'بابا میں تو کسی چوہدری صاحب کو نہیں جانتی میں اور میری ماں ہم اکیلے ہی شہر میں ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے ہیں۔ میرے بابا نے پسند کی شادی کی تھی اس لیے اُن کے گھر والوں نے میری ماں کو قبول نہ کیا تو بابا اُن کو شہر لے آئے تھے میری پیدائش کے چند مہینوں بعد ہی میرے بابا کی وفات ہو گئی۔ وہ مجھے اور میری ماما کو اکیلا چھوڑ کے چلے گئے کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔ تب سے میں اور میری ماں ہم دونوں اکیلے زندگی گُزار رہے ہیں اس دُنیا میں ہمارا ایک دوسرے کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اب نجانے میری ماں کس حال میں ہو گی۔ بابا کب آئیں گے وہ؟ مجھے لگ رہا اُن کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'

وہ اپنی ماں کا سوچ کے پھر پریشان ہو گئی تھی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

'بیٹی رونا مسئلے کا حل نہیں ہوتا تم اپنی ماں کی سلامتی کے لیے اللہ سے دُعا کرو اور دُعا کرو چھوٹے چوہدری صاحب کے جلد آنے کی اگر آپ اُن کو نہیں جانتی تو پھر ہو سکتا ہے کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔'

وہ اُسی وقت دل میں اللہ سے دُعا کرنے لگ گئی۔ بابا نے اُس کی طرف دیکھا جو کالا عبایا پہنے ہوئے تھی اور پھر اُس سے بولے۔

'اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کو ہی آزماتا ہے بیٹی۔ اُسے اللہ کی آزمائش سمجھ لو اور صبر سے اس آزمائش پہ پورا اُتر جاؤ تو اللہ کی بارگاہ میں سرخُرو ہو جاؤ گی۔ لیکن اگر آپ نے ہار مان کے ادھر سے بھاگنے کی کوشش کی تو راستے میں ہی جان سے

ہاتھ دھو بیٹھو گی کیونکہ خواب نگر سے باہر جنگل

ہے اور پھر پورا دن سفر کرو تو پھر ایک چھوٹا سا گاؤں آتا ہے اُدھر سے تقریباً ضرورت کی ہر چیز مل جاتی ہے لیکن تمہیں کوئی تمہارے شہر چھوڑنے والا نہیں ملے گا۔ اُس گاؤں سے آگے ایک دن کا سفر کرو تو پھر شہر کی حدود میں داخل ہوتے ہیں۔ میں صبح شرفو کو بھیج کے تمہارے لیے کسی لڑکی کا انتظام کروا دیتا ہوں۔ اس تنہائی میں بیٹھ کے رونے سے بہتر ہے کہ صبر کے ساتھ اللہ کے حکم کا انتظار کرو۔ اور خدا کی یہ خوبصورت زمین گھوم لو۔'

بابا اُٹھتے ہوئے گلاس ڈور کے پاس گئے اور اُس کی طرف مڑ کے بولے۔

'صبح کے وقت باہر نکل کے قدرت کی رنگینیاں دیکھنا لیکن رات ہوتے ہی ان گلاس ڈور کے آگے یہ پردے کر دینا ورنہ باہر کے منظر اندھیرے میں دیکھ کے خوفزدہ ہو جاؤ گی۔'

وہ ابھی سے ہی رات کا تصور کر کے خوفزدہ ہونے لگی۔ پھر بابا وائیٹ پینٹ ہوئی دیوار کے پاس آئے اور بولے ادھر سب دروازے اسی طرح دیواروں میں فکس ہیں یہ دیکھو ادھر سفید رنگ کا ایک بٹن بنا ہوا ہے اسے دباؤ گی تو خودبخود دروازہ کھُل جائے گا اور پھر بیڈ کے بائیں جانب جا کے بولے ادھر بھی بٹن بنا ہوا ہے اور اُس بٹن کو دبایا تو وہ دروازہ کھُل گیا اور اُس کی طرف دیکھ کے بولے ادھر ڈریسنگ روم ہے اور ساتھ اٹیچ باتھ روم ہے۔ اور کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو یہ گھنٹی کا بٹن ہے یہ دبا دینا میں آ جاؤں گا۔'

بابا کہہ کے چلے گئے اور وہ اُدھر ہی گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کے بیٹھ گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

رات کے کھانے پہ وہ دونوں باپ بیٹا آمنے سامنے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ داؤد صاحب نے خلافِ معمول اپنے صاحبزادے کو خاموش اور اُلجھا اُلجھا دیکھا تو اُن سے رہا نہ گیا۔ آخر پوچھ ہی لیا۔

'کیوں صاحبزادے؟ کیا چکر ہے؟'

اُس نے چونک کے اُنہیں ایسے دیکھا جیسے چوری پکڑی گئی۔

'کون سا چکر؟'

'یہ جو آج کل تم مجھے دے رہے ہو۔'

اُس نے نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں کہا۔

'میں سمجھا نہیں بابا جان۔'

اُنہوں نے بھی دو بدو جواب دیا۔

'میں سمجھاؤں گا بھی نہیں بیٹا جان۔'

'کیوں ؟'

'سمجھایا اُنہیں جاتا ہے جنہیں کچھ پتہ نہ ہو۔ جو پہلے ہی سمجھے سمجھائے ہوں اُنہیں کیا سمجھانا؟'

دُنیا میں وہ پہلے شخص تھے جو اُسے لاجواب کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اور وہ اُسے لاجواب اکثر کیا بھی کرتے تھے جیسے کہ اب۔

'بیٹا جان ایک بات یاد رکھنا۔ باپ ہوں تمہارا۔ لیکن کچھ کہوں گا نہیں کہ دوست بھی ہوں تمہارا۔ سمجھاؤں گا بھی نہیں کہ تم سمجھو گے نہیں۔ اور خُدا تمہارا نام ایک دفعہ تو ضرور نافرمانوں میں لکھ لے گا۔ جو کہ میں چاہتا نہیں۔'

'تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟'

'میں بس تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ اور چاہتا ہوں کہ یہ بات یاد رکھ لو۔ کبھی کبھی وقت سے پہلے سمجھ جانا چاہئیے۔ ورنہ وقت ایسا سمجھائے گا کہ کچھ سمجھنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔'

'بابا جان مجھے سمجھ نہیں آتی آپ اتنی مشکل باتیں کیسے کر لیتے ہیں؟'

'بیٹا جان جب وقت گزر جاتا ہے تب یہی باتیں بہت آسان لگنے لگتی ہیں۔'

'آپ کی باتیں سُن کے سچ میں میرا دماغ گھومنے لگا ہے۔'

'جب وقت گزر جائے گا تب دماغ کے سامنے دُنیا گھومنے لگے گی۔'

'آپ ایک بات بتائیں گے؟'

'ایک نہیں دو بتاؤں گا۔'

'تو پھر یہ بتائیے کہ آپ یہ سب مجھے کیوں کہہ رہے ہیں؟'

'میں تمہیں تو کچھ بھی نہیں کہہ رہا۔ میں تو یہ ساری باتیں اُسے کہہ رہا ہوں جو آج کل مجنوں بنا پھر رہا ہے۔'

'کل تک آپ ہی چاہتے تھے کہ آپ کا بیٹا مجنوں بن جائے۔ اور آج آپ کو ہی اعتراض ہو رہا ہے۔'

'نہیں تو مجھے کب اعتراض ہو رہا ہے؟ مجھے تو فخر ہو رہا ہے اپنے مجنوں بیٹے پر۔'

'کیا آپ چاہتے ہیں میں کھانا چھوڑ کے یہاں سے اُٹھ کے چلا جاؤں؟'

'نہیں میں چاہتا ہوں تم یہیں بیٹھ کے کھانا کھاؤ۔'

'تو پھر کھانے بھی دیں۔'

'اچھا یار کھاؤ تم کھانا۔ میں بوڑھا باپ تمہیں کیا کہہ رہا ہوں۔'

اس آخری بات پہ اپنی مُسکراہٹ چھپانے کے لیے فواز نے سر جھکاتے ہوئے بریانی کا چمچ منہ میں رکھ لیا۔

ابھی اُس کے چھکے چھڑوا کے اُس کا باپ اُس سے پوچھ رہا تھا۔

'میں بوڑھا باپ تمہیں کیا کہہ رہا ہوں۔'

وہ اپنے قہقہے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ جواب میں اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اُس نے سر اُٹھا کے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور اگلے ہی لمحے دونوں کے قہقہے ایک ہی وقت میں ڈائیننگ ہال میں گونج اُٹھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

'جو کام دیا تھا وہ ہو گیا ہے۔'

اُس نے اپنے خاص ملازم زاور سے پوچھا تھا۔

'جی چوہدری صاحب رانا بھی دو دن میں پہنچ جائے گا۔'

زاور نے ہاتھ باندھے اُس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔

اُسی وقت اُس کا موبائل بجا تھا۔ اُس نے کال اٹینڈ کر کے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

'ہاں شیرو بول۔'

اور آگے سے نجانے کیا کہا گیا تھا کہ وہ رُک گیا اور پیچھے مُڑ کے کھا جانے والی نظروں سے زاور کو دیکھا تھا۔

'تم پیچھا کرو اُس کا مجھے ہر حال میں وہ لڑکی چاہئیے۔'

اُس نے اپنی گرجدار آواز سے کہا اور فون بند کر کے زاور کا گریبان پکڑ کے وہ دھاڑا تھا۔

'اندھے ہو کیا تمہیں نظر نہیں آتا اُس کی جگہ کسی اور کو اغوا کر کے تم مجھے کہہ رہے ہو کام ہو گیا ہے۔'

اُس نے التجا کی۔

'چھوٹے چوہدری صاحب معاف کر دیں غلطی ہو گئی اُس کا حلیہ بھی اُسی طرح کا تھا جو آپ نے بتایا تھا——معاف کر دیں چوہدری صاحب۔'

'معافی چاہئیے؟ تو جاؤ تمہارے پاس سات دن ہیں شیرو نے اُسے شہر میں دیکھا ہے اس سے پہلے وہ اُسے پکڑتا وہ شیرو کو دیکھ کے بھاگ نکلی۔ جاؤ اُس لڑکی کو کہیں سے بھی ڈھونڈ کے میرے پاس لے آؤ ورنہ تم زندہ نہیں بچ پاؤ گے

بوٹیاں کر کے کُتوں کو کھلا دوں گا۔'

اپنی بات کہہ کے اُس نے اُس کا گریبان چھوڑ دیا۔ زاور نے سکون کا سانس لیا۔

اُس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔

'چوہدری صاحب گُستاخی معاف اب وہ لڑکی جسے رانا خواب نگر چھوڑ آیا ہے اُس کا کیا کرنا ہے؟'

اُس نے غصہ سے اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔

'بھاڑ میں گئی وہ لڑکی تمہیں جو کرنے کے لیے کہا ہے تم وہ کرو اور اب اس بار کوئی غلطی نہ کرنا ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔'

زاور نے اثبات میں گردن ہلائی اور اُدھر سے ہی مڑ گیا تو اُس نے بھی اپنے قدم حویلی کی جانب موڑ دیئے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلے دن وہ نہ کالج گئی اور نہ ہی یونیورسٹی۔ خود کو گھر کے کاموں میں مصروف رکھا۔ شام کو وہ کھانا بنا رہی تھی جب مسز اظفر نے اُسے مخاطب کیا۔

'آنی۔۔۔؟'

'جی ماما؟'

'بیٹا وہ میری کولیگ ہیں نا مسز بخاری۔'

'جی کیا ہوا اُنہیں؟'

'اُنہیں تو کچھ نہیں ہوا۔ لیکن اُنہوں نے مجھ سے آج ایک بات کی تھی۔'

'کس موضوع پر؟'

'اپنے بیٹے کی شادی کے۔'

'یہ تو خوشی کی بات ہے۔ آپ کو انوائیٹ کر رہی تھیں؟'

'نہیں۔'

'تو پھر؟'

'دراصل اُنہوں نے تمہارے لیے اپنے بیٹے کا پروپوزل دیا ہے۔'

'ماما پلیز۔۔۔'

'آنی بیٹا بہت اچھا پرو پوزل ہے۔ مسز بخاری بہت اچھی خاتون ہیں۔ اُن کا بیٹا بھی ہر لحاظ سے اچھا ہے۔ اچھی جاب ہے۔ خوبصورت ہے۔'

'ہو گا ماما خوبصورت۔ میں کب کہہ رہی ہوں کہ وہ خوبصورت نہیں۔ لیکن پلیز میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں میں ابھی شادی نہیں کروں گی۔'

'ماما میں آپ کو اکیلا چھوڑ کے نہیں جا سکتی۔'

اُس کی بات سُن کے مسز اظفر نے غصے سے پوچھا۔

'تو پھر کیا ساری زندگی میرے لیے اسی گھر میں بیٹھی رہو گی؟'

'اگر بیٹھنا پڑا تو ضرور بیٹھوں گی ماما۔ فی الحال میں بہت سارا پیسہ کمانا چاہتی ہوں۔ اتنا زیادہ کہ آپ کو جاب کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ جب میں بہت زیادہ امیر ہو جاؤں گی نا تب اپنی ساری دولت آپ کو دے دوں گی۔ اور پھر شادی بھی کر لوں گی۔'

مسز اظفر خاموشی سے وہاں سے چلی گئیں۔ کیونکہ وہ جانتی تھی اس بات پر بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اُس نے کون سا مان جانا تھا۔ رات کو اُن دونوں ماں بیٹی نے کھانا بھی اتنی ہی خاموشی سے کھایا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ اُس کی ماما اُس سے بات نہ کر کے خاموش احتجاج کر رہی ہیں۔ فی الحال اُس کا اُنہیں منانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اسی صورت مان سکتی تھیں جب وہ اپنا یہ ارادہ بدل کے اپنی ماں کو اکیلا چھوڑ کے پیا دیس سُدھار جائے۔ لیکن ایسا وہ کسی صورت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے خاموشی سے کھانا کھایا۔ اور باقی روٹین
کے کام کر کے سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ لیکن لیٹنے کی بجائے وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

لانبی پلکوں کی آغوش میں
سمائے ہیں وہ کالے دلکش نین
ہر قسم کے احساسات سے
عاری ہیں وہ کالے دلکش نین
آئینے کے سامنے کھڑی پری پیکر کو
دیکھ رہے ہیں وہ کالے دلکش نین
محبت کی گھمبیر اُلجھنوں کو سُلجھانے کی

کوشش میں ہیں وہ کالے دلکش نین

محبت کی اُلجھنیں بھی کبھی سلجھی ہیں؟

ہائے یہی نہ جان پائے وہ کالے دلکش نین

کافی دیر اپنے عکس کو آئینے میں دیکھتے رہنے کے بعد اُس نے اپنی سوچوں کا در کھول دیا۔ اور وہ چار مہینے پہلے کی آنیہ کا مقابلہ اس آئینے کے سامنے کھڑی آنیہ سے کرنے لگی۔

کہاں وہ آنیہ جو اپنی طرف کسی کو محبت کی آنکھ اُٹھا کے نہیں دیکھنے دیتی تھی۔

کہاں یہ آنیہ جس کی طرف وہ بہت دھڑلے سے محبت کی آنکھ اُٹھا کے دیکھ گیا تھا۔ اور بار بار دیکھا تھا۔

کہاں وہ آنیہ جس کا اگر کوئی راستہ روکے تو وہ سب کے سامنے اُس کا منہ تھپڑوں سے لال کر دیتی۔

کہاں یہ آنیہ جس کا راستہ بنا کسی ڈر کے اُس نے روکا۔ اور جب تک چاہا تب تک روکا۔

کہاں وہ آنیہ جو محبت کرنے والی لڑکیوں کو بہت بُرا سمجھتی تھی کہ وہ کیسی لڑکیاں ہیں جو اپنے نفس پہ اپنی خواہشات پہ قابو نہیں پا سکتیں۔ جو اپنا وقار بُلند نہیں رکھ سکتیں۔

کہاں یہ آنیہ جو خاموش تماشائی بنی سب دیکھ رہی تھی۔

ہاں وہ دیکھ رہی تھی۔۔۔۔

محبت کو اپنے اوپر کسی جن کی طرح قابض ہونے کی کوشش کرتے ہوئے۔

اپنے نفس اور خواہشات پہ اُس انسان کو غالب ہوتے ہوئے۔

اُس انسان کو اپنے وقار کو گرانے کی کوشش کرتے ہوئے۔

تو کیا وہ آنیہ بھی اُن محبت کرنے والی بُری لڑکیوں میں شامل ہو جائے گی؟

یا وہ اُن کمزور لڑکیوں میں شامل ہو گی جو محبت کے ڈر سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے چار دیواری میں بیٹھ جاتی ہیں؟

اُس نے بغور خود کو دیکھا تبھی اُس کے ضمیر نے اُسے جھنجوڑا۔

'ہاں بتاؤ آنیہ اظفر تم ان دونوں میں سے کن لڑکیوں میں شامل ہونا چاہو گی؟

پہلے تو مجھے لگتا تھا پہلی قسم والی لڑکیوں میں شامل ہو جاؤ گی۔ تمہیں بھی محبت ہو جائے گی۔ تم بھی بُری لڑکی بن جاؤ گی۔

لیکن آج مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ اب مجھے لگتا ہے کہ تمہارا شمار ان دوسری قسم کی لڑکیوں میں ہو گا۔ جو محبت کے

ڈر سے چھپ کے بیٹھ جاتی ہیں۔ آج تم نے بھی تو یہی کیا نا؟

ہو نہ ایک کمزور لڑکی۔۔۔

تم وہ آنیہ ہو ہی نہیں جو مضبوط اور بہادر لڑکی تھی۔ چچ چچ افسوس۔۔۔'

اپنے ضمیر کی یہ بات اُسے کسی تازیانے کی طرح لگی تھی۔ غصے سے اُس کی آنکھوں کا رنگ سُرخ ہوا۔ وہ اپنے ضمیر سے ہمکلام ہوئی۔

'آنیہ اظفر کا شُمار ان دونوں میں سے کسی قسم کی لڑکیوں میں نہ پہلے ہوا تھا نہ اب ہو گا۔ کیونکہ آنیہ مر جائے گی لیکن کبھی ایسا ہونے نہیں دے گی۔ یہ آنیہ کا خود سے وعدہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے وقار کو بُلند رکھے گی۔ اپنی نفس کو اپنی خواہشوں کے تابع نہیں ہونے دے گی۔ اور وہ 'فواز داؤد' کی محبت کے ہر وار کو ناکام لوٹائے گی۔ نہ وہ کبھی اُس کی باتوں پہ یقین کرے گی اور نہ ہی وہ کبھی اُس کے آنسوؤں پہ ایمان لائے گی۔ جتنا 'محبت کا یہ کھیل تماشہ' ہونا تھا ہو چکا۔ اب جنگ کا آغاز ہو گا۔ کچھ بھی ہو جائے 'فواز داؤد' میں تمہیں خود سے جیتنے نہیں دوں گی۔'

☆☆☆☆☆☆☆☆

اُس نے ڈرتے ڈرتے شاہ میر کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ ایک منٹ کے وقفے کے بعد دروازہ کھُلا اور اُسے دیکھتے ہی بازو سے اندر کھینچ کے دروازہ بند کیا تھا۔ اُس کے ایسا کرنے سے وہ سیدھا اُس کے ساتھ جا لگی اور پیچھے ہٹنے کی کوشش میں وہ اُس کے مضبوط بازوؤں میں پھڑ پھڑا کے رہ گئی تھی۔

'ہم سے کیوں دور دور رہتے ہیں جناب، ہمیں خدمت کا ایک دفعہ موقع تو دے کے دیکھو۔ لڑکیاں تو میری ایک نظر کے پیچھے مرتی ہیں پکے ہوئے پھل کی طرح خود ہی جھولی میں آ گرتی ہیں اور جو نہ گریں اُنہیں ہم خود ہی گرا لیتے ہیں۔'

اُس نے اُس کا ایک بازو پیچھے کی طرف کر کے مڑورتے ہوئے کہا۔ تکلیف سے اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور وہ دھیرے سے بولی۔

'صاحب، بڑے صاحب آپ کو بُلا رہے ہیں۔'

اُس نے اُسکا دوسرا بازو بھی مڑورتے ہوئے کہا۔

'تمہاری اتنی ہمت کہ ہماری بات کا جواب دیئے بنا اگلی بات کرو۔'

اُس کے منہ سے سسکی نکلی۔

'صاحب مجبوریاں آپ بڑے لوگوں کی نوکری کرنے پہ مجبور کر دیتی ہیں۔ محنت کرتی ہوں تو پیسہ لیتی ہوں آپ

کی ناجائز خواہشیں پوری کرنے کے لیے نہیں صاحب ۔ اللہ قرآن پاک میں فرماتا ہی۔'تم چاہ بھی نہیں سکتے اگر اللہ نہ چاہے' اس لیے صاحب آپ جو مرضی کر لیں آپ تب تک وہ نہیں کر سکتے جب تک اللہ نہ چاہے ۔'

اور اُس کی بات ختم ہونے سے پہلے اُس نے اُس کے منہ پہ تھپڑ مارا تھا۔

'تم دو ٹکے کی نوکرانی اب مجھے یہ بتاؤ گی کہ قرآن میں کیا لکھا ہے دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے ۔'

اُس نے دروازہ کھول کے اُسے باہر دھکیلا تھا وہ زمین پہ گری تھی اور وہ اُسے ٹھوکر لگاتا ہوا سیڑھیاں اُترنے لگا۔

وہ اُدھر ہی سجدے میں گر کے سسکنے لگی۔

'اے اللہ آپ کچھ لوگوں کو اتنا پیسہ دے دیتے ہیں کہ وہ دولت کے نشے میں چُور اپنے آپ کو خُدا سمجھنے لگتے ہیں اور ہم غریبوں کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کرنے لگتے ہیں کیوں اے اللہ کیوں ؟ کیا غریب انسان نہیں ہوتے ؟ بتائیں نہ اللہ بتائیں نہ۔۔۔۔'

☆☆☆☆☆☆☆☆

'علیزے۔۔علیزے۔۔۔علیزے۔۔۔'

اپنے نام کی پکار اور اُس کے ساتھ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز اُس کے سوئے ہوئے ذہن پہ ٹھاہ ٹھاہ کر کے لگ رہی تھی۔ اُس نے اپنے سائیڈ پہ رکھے دو کُشنز اُٹھا کے اپنے دونوں کانوں پہ رکھ لیے۔ لیکن دروازہ کھٹکھٹانے والا بھی انتہائی ڈھیٹ قسم کا انسان تھا۔ جو مسلسل یہی حرکت کرتے جا رہا تھا۔ اور وہ جانتی تھی یہ ڈھیٹ انسان کون ہے۔ اس لیے تنگ آ کے اُٹھ کے اُس نے دروازہ کھول دیا۔

'کیا تکلیف ہے تمہیں؟ کیوں صبح صبح جاہلوں کی طرح دروازہ پیٹ رہے ہو؟'

'کوئی بھائیوں سے اس طرح بات کرتا ہے؟ غریب بیچارے صبح سے کام کر کر کے اس وقت درختوں کی چھاؤں تلے بیٹھ کے سکون کا سانس لینے کے ساتھ کھانا بھی کھا چکے ہوتے ہیں۔ اور تم کہہ رہی ہو صبح صبح؟'

'اپنی یہ فضول باتیں سنانے کے لیے مجھے اُٹھایا ہے؟'

باقاعدہ گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

'نہیں تو۔ میں تو تم سے ہمدردی کرنے آیا ہوں۔'

وہ جو اُسے زبردستی باہر دھکیل کے دروازہ بند کرنے لگی تھی۔ رُک گئی۔

'کیا کہا؟'

'میں کیوں بتاؤں؟ کر دو ٹھاہ کر کے میرے منہ پہ دروازہ بند۔ اور اندر جا کے سکون سے سو جاؤ دوبارہ۔ میں جا رہا ہوں۔'

وہ یہ کہہ کے سیڑھیوں میں جانے کے لیے مڑ گیا۔ اب آگے آگے وہ تھا اور پیچھے پیچھے علیزے۔

'بتاؤ کیا بات بتانی ہے؟'

'جاؤ اپنا کام کرو میں ایسی بد تمیز لڑکیوں کو کچھ نہیں بتا سکتا۔'

وہ لاؤنج میں رکھے صوفے پہ بیٹھ گیا اور سامنے رکھا اخبار اُٹھا کے اپنے چہرے کے آگے کر لیا۔ وہ بھی اُس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

'میرو میرے بھائی پلیز بتا دو نا۔'

اخبار ہٹاتے ہوئے کہا۔

'ایسے کیسے بتا دوں؟ پہلے معافی مانگو۔'

وہ جانتی تھی وہ جب بھی ایسی حرکتیں کرتا تھا اُس کے پاس ضرور کوئی دھماکے دار خبر ہوتی تھی۔ اس لیے مجبوراً اُسے معافی مانگنی پڑی۔

'سوری۔'

'یہ کیا انگریزوں کی طرح ایک لفظ بول کے بات ختم کر دی؟ مانا کہ ہم نے ساری زندگی لندن میں گزاری ہے۔ لیکن ہم اب پاکستان میں ہیں تو مجھے انگریزوں کے ان لفظوں کو سُن کے مزہ نہیں آتا۔'

اُس کا دل کر رہا تھا کوئی گلدان اُٹھا کے اس کے سر پہ دے مارے۔

'میرے پیارے بھائی میرو۔ مہربانی فرما کے مجھے معاف کر دو۔ اور مہربانی ہی فرما کر مجھے وہ بات بھی بتا دو۔'

'اب اتنی معافیاں مانگ رہی ہو تو بتا ہی دیتا دوں۔'

'اب بتا بھی دو۔'

'حوصلہ تو رکھو۔ ایسا بے صبرا پن اللہ تعالیٰ کو بالکل بھی نہیں پسند۔ انسان میں صبر ہونا چاہیئے بڑی سی بڑی بات کے لیے بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے پیاری بہنا۔'

اب اُس کے تیور دیکھ کے لگ رہا تھا وہ سارے لحاظ بالائے طاق رکھ کے سچ میں گلدان اُٹھا کے اُس کے سر پہ دے مارے گی۔ اس لیے انسانوں کی طرح بتا دیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا یہ بات سُننے کے بعد کئی ان دیکھے گلدان اُسی کے سر پہ لگنے

والے تھے۔

'شہروز بھائی آ رہے ہیں۔'

اور یہ بات سُن کے بیچ میں وہ ان دیکھے گُلدان ٹھاہ کر کے اُس کے سر پہ آ ٹوٹے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ ابھی کلاس میں داخل ہوئی ہی تھی جب نمرہ اُسے دیکھتے ہی بولی۔

'کہاں تھی تم کل؟ اور موبائل کیوں آف تھا تمہارا؟'

وہ نمرہ کیساتھ والی سیٹ پہ بیٹھ گئی۔

'کل دراصل میں ماما کیساتھ اپنے ریلیٹوز کے گھر گئی ہوئی تھی۔ میرا موبائل گھر میں ہی رہ گیا تھا۔ بیٹری ختم ہو گئی ہو گی اس لیے بند ہو گیا ہو گا۔'

اُس نے جھوٹ بولا کیونکہ وہ فواز کو کلاس کے آخر میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھ چکی تھی۔ اُس نے یہ جھوٹ بولتے وقت اپنی آواز کا والیوم اتنا رکھا تھا کہ یہ بات پیچھے بیٹھے فواز کے کانوں تک با آسانی پہنچ جاتی۔ اور اُس کے کانوں تک پہنچ بھی گئی تھی۔ اُس کے آنے پر اُس کا دھیان دوستوں کی باتوں سے ہٹ کے آنیہ کی طرف ہو چکا تھا۔ ابھی کلاس میں چند ایک سٹوڈینٹس ہی آئے تھے۔

نمرہ نے کہا۔

'لیکن گھر آ کے موبائل تو آن کیا ہی ہو گا؟ میرے میسیجز دکھائی نہیں دیئے تھے وہاں؟ بہت بے وفا ہو۔ انسان جواب ہی دے دیتا ہے۔ تم کبھی یوں بتائے بغیر بلکہ کبھی لیکچر چھوڑتی ہی نہیں اس لیے میں پریشان ہو رہی تھی۔'

'تم پریشان ہوئی مجھے سُن کے اچھا لگا۔ لیکن الحمدُ اللہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ خیریت ہے آج وقت سے پہلے آ کے بیٹھی ہوئی ہو؟'

'ہاں تو آج میم رابعہ کی کلاس ہے جلدی آنا تو بنتا تھا۔'

'میم رابعہ کی کیوں؟ کیا میم ارم کی کلاس نہیں تھی آج؟'

'جس دن میم کا لیکچر ہے اُس دن میم کی کوئی میٹنگ ہے اس لیے میم ارم سے اُن کی کلاس میم رابعہ نے لے لی ہے۔ اب میم رابعہ کی کلاس والے دن میم ارم لیں گی۔'

'اوہ اچھا۔ ٹھیک۔'

اور پھر وہ نمرہ کا کل والا نوٹ کیا ہوا لیکچر دیکھنے لگی۔ دوسری طرف حمزہ نے علی کو کہنی مار کے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ اُس نے اشارہ سمجھتے ہوئے فواز کی طرف دیکھا جو مسلسل آنیہ کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ جو ابھی کچھ دیر پہلے زور و شور سے سیاست کے موضوع پہ اُن سے بحث کر رہا تھا۔ اور اب اچانک خاموش ہو گیا تھا۔ اُن دونوں نے کھانستے ہوئے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا ہی تھا جب باقی سٹوڈنٹس کلاس میں داخل ہونے لگے اس کا مطلب تھا میڈم آ گئی ہیں۔ وہ پیچھے والی کُرسیوں سے اُٹھ کے اپنی سیٹ پہ آ کے بیٹھ گئے۔ حسبِ معمول کلاس کا آغاز ہو گیا۔ میم نے اٹینڈینس لی اور پڑھانا شروع کر دیا۔ میم نے ایک ٹاپک سمجھانے کے بعد پوچھا۔ اس کے سب Steps آپ کو سمجھ آ گئے ہیں نا؟

کچھ سٹوڈینٹس کی آواز گونجی۔

'یس میم۔'

لیکن آنیہ سے پچھلی رو میں بیٹھی فاطمہ نے ساتھ بیٹھی ثمرہ سے کہا۔

'ثمرہ ہمیں میم نے Steps کر کے ہی کب دکھائے ہیں؟ جو ہمیں سمجھ آتے؟'

ثمرہ نے سرگوشی کی۔

'چلو میم سے کہو ہمیں کر کے دکھائیں۔'

اُن کی یہ بات آنیہ نے بھی سُن لی اور ہزار روکنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی مُسکراہٹ اُس کے لبوں کو چھو گئی۔

بس وہیں میم رابعہ نے دیکھ لیا۔

'مس آپ کیوں کھکھلا رہی ہیں؟'

وہ ایسے ڈر گئی جیسے ہر طالب علم ساری کلاس کے سامنے پوائنٹ آؤٹ کیے جانے پہ ڈرتا ہے۔ کانوں سے دُھواں نکلنے لگتا ہے۔ اُس کے کانوں سے بھی دھُواں نکلنے لگا تھا میم سے جو ہونے والی تھی اُسی کے بارے میں سوچ کر۔

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بیٹھی بھی فرنٹ رو پہ تھی میم پوری توجہ سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔

'میں نے کچھ پوچھا ہے؟ بتاؤ ہمیں بھی اپنی ہنسی کی وجہ تا کہ ہم بھی ہنس سکیں۔'

'وہ میم۔۔ میں نے پیچھے سے ایک کمنٹ سُنا تھا اُسی پہ ہنسی آ گئی۔ میرا ایز یچ ہنسنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ سوری میم۔'

'کیا کمنٹ سُنا تھا؟ اور کس نے کہا تھا؟'

اب وہ میم کو یہ تو نہیں بتا سکتی تھی کہ یہ کمنٹ سُنا تھا کہ میم ہمیں پہلے Steps (ڈانس کے سٹیپس) کر کے دکھائیں پھر ہمیں سمجھ آئے گی۔

'میم مجھے نہیں پتہ کس نے کہا تھا۔'

'اچھا تو وہ کمنٹ کونسا تھا؟'

'میم میں وہ آپ کو نہیں بتا سکتی۔'

اس سے پہلے میم سے اُس کی ہوتی اور میم پوچھ کے ہی اُس کی جان بخشی کرتیں۔ فواز بول پڑا۔

'میم آج آپ نے کہا تھا کہ بس زیادہ سے زیادہ پڑھنا ہے۔ تو اس طرح وقت ضائع ہو رہا ہے۔'

میم اُس کی طرف دیکھ کے بولیں۔

'اچھا تمہیں وقت کے ضائع ہونے کی بہت فکر ہو رہی ہے۔'

'بس میم یہ تیسرا سمیسٹر ہے آپ سے پڑھتے ہوئے اس لیے فکر تو ہو گی نا اپنے وقت کے نہیں۔ آپ کے وقت کے ضائع ہونے کی۔'

اُس کی بات سے زیادہ میم کا دھیان حمزہ اور علی کی طرف چلا گیا۔ جو ہونق بنے فواز کو دیکھ رہے تھے۔ میم نے ٹیبل پہ رکھے بورڈ مار کر دونوں ہاتھ میں ایک ایک تھامے اور اُن دونوں پہ نشانہ لگا دیا۔ وہ جس طرح اچانک بورڈ مار کر لگنے سے چونکے تھے۔ اُن کے انداز سے میم کے قہقہے کلاس میں گونج اُٹھے اور پھر باقی لوگوں کے بھی۔

'یہ تم دونوں کو کیا ہوا تھا تم لوگ کیوں ایسے اُسے دیکھ رہے تھے جیسے لوگ کسی عجوبے کو پہلی دفعہ دیکھتے ہیں۔'

اپنی اس بات پہ میم خود ہنسنے لگ گئیں۔

'چلو بس بہت ہو گیا۔ اب واپس آ جاؤ پڑھائی پہ۔'

میم نے دوبارہ پڑھانا شروع کر دیا۔ اور حمزہ نے اپنا ر جسٹر فواز کے آگے کیا۔ جس پہ لکھا تھا۔

'تم آج کلاس ختم ہونے کے بعد ہم سے باہر ملو ذرا۔'

☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ کافی دیر اسی طرح بیٹھی رہی۔ پھر یوں ہی جب گردن اُٹھائی تو اُس کی نظر گلاس ڈور پہ پڑی جدھر شام کے سائے رُخصت ہوتے دکھائی دیے۔ وہ اُسی وقت بیڈ سے چھلانگ لگا کے اُتری۔ فٹافٹ گلاس ڈور کے آگے کرٹن کیے تھے۔ پھر اُس کی نظر اپنے عبایا پہ پڑی۔ وہ عبایا اُتارنے کے لیے ڈریسنگ روم میں آ گئی۔

دروازہ کھولتے ہی اُس کی نظر اوپر والی دیوار سے لٹکے خوبصورت سے فانوس پہ پڑی۔ جس کا عکس سامنے آئینے میں بھی نظر آ رہا تھا دائیں سائیڈ پہ الماری بنی ہوئی تھی اُس نے آگے بڑھ کے الماری کے دونوں پٹ وا کیے۔ اندر مردانہ

سوٹ ہینگر میں لٹکے ہوئے تھے اُس نے الماری بند کر دی اور پھر بائیں طرف دیکھنے لگی جدھر اوپر تین اوپن خانے بنے ہوئے تھے سب سے اوپر والے میں کچھ ڈبے رکھے ہوئے تھے اُس سے نیچے والے میں باتھ ٹاول تہہ کر کے رکھے ہوئے تھے اور تیسرا خانہ خالی تھا اُس میں بس سائیڈ پہ ایک چھوٹا سا گول شیشہ رکھا ہوا تھا جس کے اردگرد چاندی کے کام جیسا بارڈر لگا ہوا تھا اور اُس کے نیچے دراز بنے ہوئے تھے اُس نے ایک دراز کھولا۔ اُس کی نظر اندر رکھے پسٹل پہ پڑی۔ اُس نے فوراً دراز بند کر دیا۔ پھر باقی بائیں دیوار پہ اور سامنے والی دیوار پہ ڈریسنگ ٹیبل بنا ہوا تھا۔ آئینہ کے سامنے ڈریسنگ چیئر رکھی ہوئی تھی سامنے والی دیوار کے ساتھ باتھ روم کا دروازہ تھا جو کہ کھُلا ہوا تھا اور اُدھر سے باتھ روم کی دیوار پہ لگا فُل سائز آئینہ دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے اندر قدم رکھا تو مبہوت ہی رہ گئی چاروں طرف سٹینڈ رکھے ہوئے تھے جن میں موم بتیاں جل رہی تھیں کمرے سے لے کے واش روم تک ہر جگہ سفید پینٹ ہوا تھا اور ہر چیز سفید رنگ کی تھی۔ وہ باہر آئی اور الماری سے ایک بلیک کلر کا مردانہ سوٹ نکالا اور ایک براؤن مردانہ شال اور شاور لینے چلی گئی۔ شاور لینے کے بعد اُس نے اپنا عبایا اور سوٹ دھویا اور نچوڑ کے واش روم میں ہی لٹکا دیا۔

اُسے دروازہ ناک کرنے کی آواز سُنائی دی۔ وہ کمرے میں آئی تو سامنے بابا کو کھڑے پایا۔

بابا اُسے دیکھتے ہی بولے۔

'بیٹی یہ کیا غضب کر دیا۔'

وہ حیرانی سے اُنہیں دیکھنے لگی یوں جیسے کہہ رہی ہو میں نے کیا غضب کیا ہے؟

'چھوٹے چوہدری صاحب اپنا جوتا بھی دوسروں کے پاؤں میں نہیں دیکھ سکتے آپ نے تو پھر اُن کا سوٹ پہن لیا ہے اُن کو پتہ چل گیا تو وہ مجھے نوکری سے ہی نکال دیں گے۔'

'تو کیا یہ اُن کا کمرہ ہے؟ تو آپ نے مجھے ادھر ٹھہرایا کیوں؟'

'کیوں کہ چوہدری صاحب کا حکم تھا کہ آپ کو اُن کے کمرے میں ٹھہرایا جائے۔'

اُس نے چڑتے ہوئے کہا۔

'تو پھر آپ بے فکر ہو جائیں ایک تو مجھے بلاوجہ اغوا کروا کے میرے شہر سے میلوں دور اس خوفناک جگہ پہنچا دیا گیا ہے۔ پتہ نہیں میری ماں کا کیا حال ہوتا ہو گا۔ اور دوسرا میں شوق سے تو ادھر نہیں آئی جو ساتھ اپنے کپڑے بھی لاتی میں نے اپنے کپڑے دھو دیئے ہیں خشک ہوں گے تو بدل لوں گی۔'

بابا چُپ ہو گئے اور پھر بولے۔

'میں نے کھانا لگوا دیا ہے ڈائننگ ٹیبل پہ، آپ ڈائننگ روم میں آ جاؤ بیٹی۔'

وہ اُن کے پیچھے چلنے لگی اور جب وہ دروازے سے باہر نکلی۔ اُسے لگا جیسے وہ پریوں کے سفید محل میں آ گئی ہو چاروں طرف کمرے بنے ہوئے تھے اور ہر کمرے کی سائیڈ پہ بڑے سے شیشے کے گُلدان رکھے ہوئے تھے جن میں رنگ برنگے پھول سجے ہوئے تھے اور اُن کے آگے بڑا سا کھُلا دالان بنا ہوا تھا جس کے درمیان میں سفید بڑا سا صوفہ رکھا ہوا تھا صوفہ کے آگے بڑا سا شیشے کا ٹیبل تھا جس پہ شیشے کا ہی گلدان رکھا گیا تھا اُس میں بھی پھول سجے ہوئے تھے ان پھولوں کی خوشبو سے پورا محل مہک رہا تھا دونوں طرف سے گولائی میں سیڑھیاں اوپر کو جا رہی تھیں جو اوپر جا کے آپس میں مل گئیں تھیں اور اُوپر والا حصہ بھی نیچے کی طرح ہی لگ رہا تھا اور اُس کے اوپر بھی اسی طرح سیڑھیاں جا رہی تھیں پھر اوپر چھت تھی اور اُس پوری چھت سے شیشے کے فانوس لٹک رہے تھے جن سے سفید روشنی نکل رہی تھی۔

'بابا اتنے بڑے محل میں کوئی نہیں رہتا کیا؟'

'نہیں۔۔!!! چھوٹے صاحب سال میں صرف ایک مہینے کے لیے آتے ہیں۔ ورنہ پہلے تو کوئی ایک دو دن سے زیادہ ادھر ٹھہرتا نہیں تھا۔'

بابا نے چلتے ہوئے کہا اور وہ بھی اُن کے پیچھے چلنے لگی۔ اُنہوں نے ایک دروازہ کھولا تو سامنے ہی ایک بڑا سا شیشے کا ڈائننگ ٹیبل تھا جس کے گرد سفید رنگ کی جدید قسم کی صوفہ ٹائپ کُرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور ٹیبل کے درمیان میں ایک بڑا سا شیشے کا کینڈل سٹینڈ رکھا ہوا تھا جس میں رنگ برنگی موم بتیاں جل رہی تھیں اور دائیں بائیں شیشے کے گُلدان تھے جن میں اصلی پھُول رکھے ہوئے تھے اس کے علاوہ ٹیبل پہ مختلف قسم کے بھُنے ہوئے گوشت، پھل اور تین چار طرح کے جوسز رکھے ہوئے تھے سامنے ہی کچن نظر آ رہا تھا بابا نے کسی گُل خان کو پُکارا۔

وہ اُسی وقت بوتل کے جن کی طرح کچن سے حاضر ہوا۔

وہ ایک اٹھارہ اُنیس سال کا پٹھان لڑکا تھا اُس نے اُسے دیکھتے ہی آگے آ کے اُس کے لیے کُرسی پیچھے کی۔ وہ بیٹھ گئی۔ اُس نے روسٹ ہوئے گوشت کی ٹرے اُٹھا کے اُس کے آگے کی۔ اُس نے پکڑتے ہوئے اُسے کہا۔

'جاؤ تم اپنا کام کرو میں خود لے لوں گی۔'

اور پھر ہاتھ باندھے مودب انداز میں کھڑے بابا سے کہنے لگی۔

'بابا مجھے ایک بات سمجھ نہیں آ رہی مجھے اغوا کیا گیا ہے نا تو پھر میرے ساتھ اس طرح کیوں پیش آیا جا رہا ہے جیسے میں ادھر کی شہزادی ہوں، آپ مجھے ٹھیک طرح بتا کیوں نہیں رہے۔'

'بیٹا ہم ملازم لوگ ہیں ہم سے جو کہا جائے ہم وہ ہی کرتے ہیں ابھی کچھ دیر پہلے چھوٹے صاحب کے خاص ملازم کا فون آیا تھا وہ کہہ رہا تھا کہ آپ ہماری مہمان ہیں آپ کا خیال رکھا جائے کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہئیے۔'

اُس نے روتے ہوئے آئیذہ کے حالات کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔

'بابا مہمانوں کو یوں اغوا کر کے لایا جاتا ہے کیا؟ مہمان نہیں ہوں میں اغوا شُدہ ایک لڑکی ہوں۔ جس پہ اغوا ہوئی لڑکی کا لیبل لگ چکا ہے یہ معاشرہ یہی کہے گا اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ گئی ہو گی اپنے طعنوں سے مجھے جیتے جی مار دے گا ۔میری ماں کے علاوہ کوئی میرا اعتبار نہیں کرے گا۔'

اُس کی بھوک ہی اُڑ گئی تھی وہ اُدھر سے اُٹھ کے کمرے میں بھاگ گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اُس کی نظریں سامنے ٹی وی پہ تھیں۔ جہاں میچ چل رہا تھا۔ میچ دیکھنے کے ساتھ وہ اپنی گود میں رکھے پاپ کارن کے باؤل میں سے پاپ کارن اُٹھا اُٹھا کے مسلسل کھاتا جا رہا تھا۔

'میرو؟'

'جی ماما؟'

'علیزے کہاں ہے؟'

'ماما آپ تو مجھ سے ایسے پوچھ رہی ہیں جیسے وہ مجھے بتا کے جاتی ہے۔'

اُس کی بات سے وہ بھی خاموشی سے اُس کے ساتھ بیٹھ گئیں۔

'کیا ہوا ماما؟ آپ پریشان ہیں؟'

'پریشان۔۔۔ہاں۔۔۔نہیں۔۔'

اُس نے ٹی وی کا والیوم بند کر دیا۔ اور اُن کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

'ماما آپ مجھے بتا سکتی ہیں۔'

'وہ دراصل میں علیزے سے شہروز کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی۔'

'رہنے دیں ماما۔ اس کی آپ کو ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کا کام آسان کر چکا ہوں۔'

'کیا مطلب؟'

'میں نے اُسے بتا دیا ہے کہ شہروز بھائی آ رہے ہیں۔'

'تو پھر کیا کہا اُس نے ؟'

'اتنا کچھ تو کہہ رہی ہے۔ کیا آپ کو سُنائی نہیں دے رہا؟'

'میرو کیوں نہیں سیدھی طرح بات کر رہے ہو؟ کیوں مجھے اُلجھا رہے ہو؟'

'ماما وہ صبح سے گھر میں نہیں ہے۔ اور اب عشاء کی آذان بھی ہو چکی ہے۔ لیکن وہ گھر واپس نہیں آئی۔ یہ اُس کا خاموش لیکن خطرناک احتجاج ہے۔'

'خطرناک کیوں؟ کیا وہ کچھ کرنے والی ہے؟'

'ماما وہ اور کیا کرے گی؟ جو کر رہی ہے وہ کیا کم ہے؟ اور یہ خطرناک بات ہی ہے کہ وہ رات کے وقت اکیلی باہر ہے۔ ماما نہ ہی حالات اچھے ہیں اور نہ ہی لوگ۔ اس لیے لڑکیوں کو یوں رات کے وقت اکیلے باہر نہیں رہنا چاہئیے ماما۔'

'اگر تمہاری بہن کو خود ہی نہیں اس بات کا احساس تو ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں؟ مجھے سمجھ نہیں آ رہی یہ لڑکی آخر چاہتی کیا ہے؟ شہروز سے منگنی اس نے خود اپنی پسند سے کروائی ہے۔ اور اُس بچے نے اپنے باپ کی بات کا مان رکھنے کے لیے ہاں کر دی۔ ورنہ سب جانتے ہیں اُس کی کمٹمنٹ کسی اور لڑکی کے ساتھ تھی۔ اور اب جب وہ اس سے محبت کرنے لگا ہے شادی کرنا چاہتا ہے تو یہ انکار کیوں کر رہی ہے؟ پاکستان آ کے نجانے اسے کیا ہوا ہے؟ اچانک ہی اس نے شہروز سے رابطہ ختم کر دیا ہے۔ اب جب وہ آ رہا ہے اس میں مسئلہ کیا ہے؟ اس طرح بھاگنے کی بجائے اسے چاہئیے کہ وہ سامنا کرے اُس کا۔ بات کرے اُس سے۔ اگر کوئی جھگڑا ہے کوئی شکایت ہے اُسے بتائے۔ ایسے تو نہیں ہوتا نا چھوٹی چھوٹی باتوں پہ رشتے ختم کر دیے جائیں۔'

'ماما اُن کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ اور نہ ہی شہروز بھائی کے یا کسی اور کے بات کرنے کا کوئی بھی فائدہ ہو گا۔'

'آخر کیوں؟'

'کیونکہ ماما وہ شہروز سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔'

اُس کی بات سُن کے وہ شاکڈ ہو گئیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

دیپ جس کا محلات میں ہی جلے

چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے

وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو۔۔۔۔۔ صبحِ بے نور کو
میں نہیں مانتا۔۔۔ میں نہیں جانتا
میں بھی خائف نہیں تختہ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے
ظلم کی بات کو۔۔۔۔۔جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا۔۔۔۔۔۔ میں نہیں جانتا
پھول شاخوں پہ کھلنے لگے تم کہو
جام رندوں کو ملنے لگے تم کہو
چاک سینوں کے سلنے لگے تم کہو
اس کھلے جھوٹ کو ذہن کی لوٹ کو
میں نہیں مانتا۔۔ میں نہیں جانتا
تم نے لوٹا ہے صدیوں ہمارا سکوں
اب نہ چلے گا۔۔ ہم پر تمہارا فسوں
چارہ گر دردمندوں کے بنتے ہو کیوں؟
تم نہیں چارہ گر۔۔۔۔ کوئی مانے مگر
میں نہیں مانتا۔۔۔۔۔ میں نہیں جانتا

(حبیب جالب)

☆☆☆☆☆☆☆☆

ساری رات اُس نے روتے ہوئے گزار دی۔ کبھی ماں کی پریشانی سے دل ہول اُٹھتا۔ اور کبھی انجان خوفناک و پُر اسرار جگہ کا خوف اُس کا دل بھینچ لیتا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کرے تو کیا کرے۔ وہ اپنی ماں کے پاس جانا چاہتی تھی۔ صبح فجر کے وقت اُس کا دل اچانک بہت زیادہ گھبرانے لگا۔ اُس نے جلدی سے وضو کر کے نماز ادا کی۔ نماز ادا کرنے کے بعد

گھبراہٹ کم ہونے کی بجائے اور زیادہ ہو گئی۔ دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا۔ وہ اُٹھ کے جائے نماز تہہ کر کے رکھنے لگی تھی جب اُسے چکر آیا اور وہ وہیں زمین بوس ہو گئی۔ جب بابا۔۔ گُل خان کے ساتھ اُس کے لیے ناشتہ لے کے آئے اور اُسے فرش پہ بے ہوش دیکھ کے اُن کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ گُل خان بھی پریشان ہو گیا۔ کھانے والی ٹرے سائیڈ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے گلاس میں پانی ڈال کے اُس کے منہ پہ چھینٹے مارنے لگا۔ لیکن اُس میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔

بابا جو اُس کے پاس بیٹھ کے اُس کے ہاتھ سہلا رہے تھے اُنہوں نے گُل خان کو مخاطب کیا۔

'گُل خان؟'

'جی بابا؟'

'جلدی سے زاور کا نمبر ملاؤ۔'

گُل خان نے اپنی جیب سے موبائل نکال کے جلدی سے نمبر ملایا اور فون بابا کو تھما دیا۔ اُس کے فون اُٹھاتے ہی بابا نے ساری صورتحال سے اُسے آگاہ کیا۔ اُس نے کہا کہ وہ جلد ہی چھوٹے چوہدری سے بات کر کے دوبارہ فون کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ابھی میم اُن کی کلاس سے باہر گئی ہی تھیں جب جی آر نے ضروری اناؤنسمنٹ کا کہہ کے اُن سب کو کلاس سے باہر جانے سے روک لیا۔

'کلاس ۔۔۔ اس دفعہ separate groups نہیں بنیں گے میم نے بولا ہے کہ آپ لوگ Co groups (لڑکے اور لڑکیوں کا اکٹھا گروپ) بنائیں۔ چھ لوگوں کا گروپ بنے گا۔ اس لیے آپ لوگ کل تک فائنل کر کے مجھے اپنے گروپس کے نام دے دیجئیے گا۔ جس نے نہ سینڈ کیا تو میں اُس کو خود ہی کسی گروپ میں ایڈجسٹ کر دوں گی۔ بعد میں نہ کہیے گا۔'

جی آر کی اناؤنسمنٹ سُننے کے بعد سب لوگ کلاس سے باہر نکلنے لگے۔ تبھی علی اور حمزہ نے فواز کو گھیر لیا۔ علی نے اپنا بازو اُس کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

'بتا شہزادے۔۔۔'

اُس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

'کیا بتاؤں؟'

دوسری طرف سے حمزہ نے بھی اپنا بازو ڈالتے ہوئے کہا۔

'وہی جو چل رہا ہے۔'

'کیا چل رہا ہے؟ اور کہاں چل رہا ہے؟'

علی نے جواب دیا۔

'کیا چل رہا یہ تو ہم پوچھ رہے ہیں۔'

حمزہ کہنے لگا۔

'اور کہاں چل رہا ہے اس کا جواب میں تمہیں دے دیتا ہوں۔'

پھر اُس کے دل پہ ایسے اُنگلی سے دستک دی جیسے دروازے پہ دیتے ہیں۔

'یہاں شہزادے یہاں جو چل رہا ہے وہ بتا دے۔'

'کیا یار کچھ بھی نہیں چل رہا۔'

علی نے اُس کے انجان پن پہ حیران ہوتے ہوئے کہا۔

'اوہ اچھا سیر یسلی کچھ بھی نہیں چل رہا؟ تو پھر وہ کلاس میں سب کیا تھا؟'

اُس نے پہلے سے بھی زیادہ انجان بنتے ہوئے کہا۔

'مجھے نہیں پتہ آپ لوگ کیا پوچھ رہے ہو۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔'

حمزہ نے کہا۔

'تم ٹینشن نہ لو۔ ہم تمہیں سمجھاتے ہیں۔ یہ کلاس میں کسی کو دیکھ کے کہیں کھو جانا۔ باتیں کرتے کرتے چُپ ہو جانا۔۔۔'

علی نے اُس کی بات کاٹ کے کہا۔

'اور تو اور میم رابعہ کی ڈانٹ سے بچانا۔'

حمزہ بولا۔

'ہاں اور وہ بھی اُس لڑکی کو۔ جس کے لیے اس کے ارادے انتہائی خطرناک تھے۔ ایسے لگتا تھا یہ اُسے آگ لگا دے گا۔ بھُسم کر ڈالے گا۔'

علی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

'تو اور کیا سبھی آثار کہتے ہیں کہ محبت ہے۔ لیکن مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی کہ اس انسان کو اُس سے محبت

کیسے ہو سکتی ہے؟'

'کیوں نہیں ہو سکتی مجھے اُس سے محبت؟'

اُس نے علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کے لہجے میں نجانے ایسا کیا تھا جس نے علی کو اپنا بازو ہٹانے پہ مجبور کر دیا اور حمزہ بھی اُسے سیریس ہوتے ہوئے دیکھ کے خاموش ہو گیا اور اُس کی گردن کے گرد سے اپنا بازو ہٹا لیا۔ وہ لوگ کلاس کے پچھلے دروازے سے باہر نکلے تھے اور وہیں کھڑے تھے۔ وہ تینوں خاموشی سے چلنے لگے تبھی کلاس کے اگلے دروازے سے نمرہ اور آنیہ کو نکلتے دیکھا۔

'یار اب یہ کو گروپس۔۔ کس کے ساتھ گروپ بنانا ہے؟' نمرہ کی بات سُن کے آنیہ نے کہا۔

'پتہ نہیں یار میں کون سا جانتی ہوں لڑکوں کو۔۔۔ اب مجھے کیا پتہ کہ کون کیسا ہے کس کے ساتھ گروپ بنانا چاہئیے کس کے ساتھ نہیں۔'

'ہاں یہی تو مسئلہ ہے کہ ہم لوگ جانتے نہیں۔'

'آپ لوگ ہمارے ساتھ گروپ بنا لیں۔'

فواز کی بات سُن کے اُن دونوں نے رُکتے ہوئے پلٹ کے دیکھا۔ وہ اس بات سے لاعلم تھیں کہ وہ لوگ اُن کے پیچھے آ رہے ہیں۔ نمرہ نے سمجھا گویا سارا مسئلہ ہی حل ہو گیا ہے۔ لیکن آنیہ کی بات سے اُس کا موڈ آف ہو گیا۔ جس نے بہت تلخ لہجے میں اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

'بہت شکریہ مسٹر فواز داؤد۔ لیکن میں تمہارے ساتھ گروپ نہیں بنانا چاہتی۔'

فواز کو اب اُس سے اس طرح صاف انکار کی اُمید ہرگز نہیں تھی۔ وہ وہی پہلے دن کی طرح ہی لگ رہی تھی۔ آج تو یوں لگ رہا تھا جیسے درمیان میں وہ دن آئے ہی نہیں۔ جب فواز کی ایک نظر سے ہی اُس کی پلکیں لرزنے لگتی تھیں۔ لفظ اٹکنے لگتے تھے۔ انکار کرتے کرتے بھی انکار نہیں کیا کرتی تھی۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایک دن میں ہی آخر ایسا کیا ہوا ہے جو وہ اتنا بدل گئی ہے۔ سوچوں سے نکل کے جب اُس نے دیکھا وہ وہاں سے نجانے کب کی جا چکی تھیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ رات کو دس بجے کے بعد گھر لوٹی تھی۔ سامنے ہی لاؤنج میں اُس نے ماما۔۔ بابا۔۔ اور میرو۔۔ کو بیٹھے دیکھا۔ لیکن پھر بھی وہ اُنہیں نظر انداز کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جانے لگی جب بابا کی پکار سُن کے وہ اُن کے سامنے آ کے بیٹھ گئی۔

'جی بابا؟'

'یہ کیا طریقہ ہے علیزے؟'

'کون سا طریقہ بابا؟'

'رات کے دس بج چکے ہیں اور تم اب تشریف لا رہی ہو۔'

'پہلے بھی تو اسی وقت تشریف لاتی ہوں۔'

'یہ پاکستان ہے علیزے۔'

'سو واٹ۔۔۔؟'اُنہوں نے حیرت سے پوچھا۔

'سو واٹ؟؟؟؟'

'جی بابا۔۔۔ پاکستان تو آزاد ملک ہے نا؟ یہاں ہم آزادی سے جب تک مرضی باہر رہ سکتے ہیں۔'اُنہوں نے غصے سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

'آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جوان بیٹی آدھی آدھی رات تک سڑکوں پہ آوارہ گردی کرتی رہے۔ یہ میری پہلی اور آخری وارننگ تھی۔ آئیندہ تم مجھے شام کے بعد بھی گھر سے باہر نظر نہ آؤ۔ ورنہ تمہاری ٹانگیں توڑ کے اندر کمرے میں بند کر دوں گا۔ تم لوگوں نے میرا پیار دیکھا ہے میرا غصہ نہیں۔ اور بہت اُٹھا لیے تم لوگوں کے لاڈ بھی۔۔۔'اپنے بابا کے پہلی دفعہ ایسے الفاظ سُن کے وہ اپنی جگہ پہ ہی لرز گئی۔ لرز تو خاموش تماشائی بنے بیٹھے باقی دو لوگ بھی گئے تھے۔ وہ وہاں سے جانے لگے جب دوبارہ رُک کے اُس کی طرف دیکھ کے بولے۔

'اور ایک بات یاد رکھنا شادی تو تمہاری شہروز سے ہی ہوئی تھی۔ کیونکہ وہاں منگنی تم نے ہی بہت شوق سے کروائی تھی۔'اُن کے وہاں سے جانے کے بعد علیزے نے غصے سے باقی دونوں افراد کی طرف دیکھا۔ یوں جیسے اُنہوں نے شکایت لگائی ہو اُس کی۔

وہ دونوں تو وہیں بیٹھے تھے جب بابا نے خود آ کے علیزے کا پوچھا۔ اُس کے گھر سے باہر کا سُن کے وہ وہیں بیٹھ کے اُس کا انتظار کرنے لگے۔ اُن کے غصے والے تیور دیکھتے ہوئے وہ دونوں بھی وہیں بیٹھے رہے تھے۔

میرو اُس سے بات کرنے کے لیے اُٹھا ہی تھا جب وہ اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔ اُس کے پیچھے وہ بھی بھاگا۔ علیزے دروازہ بند کرنے لگی تھی جب میرو نے دروازے میں اپنا ہاتھ دیتے ہوئے اُسے دروازہ بند کرنے سے روک کے اندر آ گیا۔

اُس نے روتے ہوئے چیخ کے کہا۔

'جاؤ یہاں سے دفعہ ہو جاؤ۔۔۔'

میرو نے اُسے زبردستی اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

'تم رو کیوں رہی ہو؟ ابھی میں زندہ ہوں۔۔۔ تمہارا بھائی ابھی زندہ ہے۔ یقین مانو اگر تم نہیں چاہتی تو تمہاری وہاں شادی میں نہیں ہونے دوں گا۔ مجھ پہ بھروسہ رکھو۔ شہروز بھائی آرہے ہیں تو آنے دو۔ تم کیوں پریشان ہو رہی ہو؟'

'میرو میں اُس سے نہیں شادی کرنا چاہتی۔۔۔ میں کیا کروں۔۔۔ میرا دل اب نہیں مان رہا اُس سے شادی کرنے کو۔'

'اچھا نہ کرو۔۔۔ تمہارے ساتھ زبردستی نہیں ہونے دوں گا۔ لیکن مجھے ایک بات سچ سچ بتاؤ۔'

اُس کے کندھے سے اپنا سر اُٹھاتے اور اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

'کون سی؟'

'یہی کہ۔۔۔ کسی اور کو پسند کرتی ہو؟'

اُس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

'نہیں۔۔۔ اگر کسی اور کو پسند کرتی تو اُس کا نام لیتی۔ بتاتی کہ مجھے شہروز سے نہیں اُس انسان سے شادی کرنی ہے۔'

'ٹھیک ہے تم پھر ریلیکس رہو۔۔۔ بابا پاکستان آکے بالکل ہی بدل گئے ہیں۔ اس لیے کوشش کیا کرو گھر سے باہر کم ہی نکلا کرو۔ اگر کہیں جانا ہو تو مجھے ساتھ لے جایا کرو۔'

'ٹھیک ہے۔'

☆☆☆☆☆☆☆☆

اُس نے اپنی اُنگلی سے دروازے پہ دستک دیتے ہوئے کہا۔

'بابا جان۔'

'آجاؤ شاہ میر۔'

اُس نے اندر داخل ہو کے بابا جان اور بی بی جان سے پیار لیا اور اُن کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ بابا جان نے حقے کی نالی منہ سے نکال کے دُھواں بند کمرے کی فضا کے حوالے کرتے ہوئے پوچھا۔

'کچھ پتہ چلا اُس لڑکی کا؟'

ابھی وہ جواب دینے ہی لگا تھا کہ اُس کا فون بجنے لگا۔ اُس نے دیکھا شیرو کا فون تھا تو اُٹھا لیا۔

'ہاں شیرو بول؟'

'چوہدری صاحب خواب نگر سے فون تھا کہ وہ لوگ ناشتہ دینے اُس لڑکی کے کمرے میں گئے لیکن وہ زمین پہ بے ہوش پڑی ہوئی ملی۔ پانی کے چھینٹے مار کے ہوش میں لانے کی کوشش کی ہے لیکن پھر بھی اُسے ہوش نہیں آیا۔'

'اُسے بول میرے کمرے کی الماری میں ایک لال رنگ کی شیشی پڑی ہوئی ہے۔ اُس میں جو پاؤڈر ہے وہ اُسے سونگھائے۔ اور اُس کا خیال رکھیں۔ میں کوشش کرتا ہوں وہاں جانے کی۔' اُس کے فون بند کرنے کے بعد بابا جان نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ تو وہ اُنہیں تفصیل سے بتانے لگا۔

'جی بابا جان۔ وہ لڑکی دراصل ہماری مخالف پارٹی کی طرف سے بھیجی گئی تھی جس کا مقصد ہماری کمپنی کی ساری اہم معلومات کو مخالف پارٹی تک پہنچانا تھا اس کام کے لیے وہ اُن سے خطیر رقم لے رہی تھی۔ جب اُسے علم ہوا کہ اب اُس کا راز فاش ہو چکا ہے تو وہ بھاگ نکلی۔ اُس کو ڈھونڈنے کے لیے کچھ آدمی اُس کے پیچھے لگائے تھے۔ لیکن وہ انتہائی شاطر لڑکی تھی خبر ملی کہ وہ بُرقعہ پہن کے اور نقاب کر کے گھر سے باہر نکلتی ہے تا کہ پہچانی نہ جائے۔ اور اسی چکر میں وہ لڑکی تو نہ ہاتھ آئی لیکن اُس کی جگہ شیرو کسی اور بُرقعے والی لڑکی کو اُٹھوا کے خواب نگر بھی پہنچا آیا ہوا ہے۔'

اُس کی بات سُن کے تسبیح پڑھتیں بی بی جان کا ہاتھ دل پہ پڑا۔

'ہائے او ظالم۔۔ کس کی ماں کو جیتے جی مار دیا ہے تُو نے۔'

'بی بی جان یوں اتنی اتنی باتوں پہ کوئی نہیں مرتا۔' بی بی جان نے دہل کے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے شاہ میر سے کہا۔

'نہ او پُتر میں تو تیری ایسی تربیت نہ کی۔ لیکن تیرے باپ نے تجھے بگاڑ دیا۔ اب تُو اور تیرا باپ یہ دُعا کرو کہ خُدا تمہاری بیٹیوں کو یوں کسی کے ہاتھوں غلطی سے اغوا نہ کروالے۔ تم لوگوں کو یہ بتانے کے لیے کہ اتنی اتنی باتوں پہ کوئی نہیں مرتا۔' بی بی جان کی بات سیدھا بابا جان کے دل پہ لگی تھی اُنہوں نے اپنے رُعب دار لہجے میں اُسے حکم دیتے ہوئے کہا۔

'جاؤ شاہ میر ابھی کے ابھی وہاں جاؤ اور اُس لڑکی کو بحفاظت اُس کے گھر پہنچا کے آؤ۔' بی بی جان نے اپنا حکم صادر کیا۔

'نہیں اُسے سیدھا یہاں حویلی لے کے آؤ۔ ہم خود اُسے اُس کے گھر چھوڑ کے آئیں گے۔'

'بی بی جان آپ کیوں زحمت کر رہی ہیں؟ میں خود اُسے چھوڑ آؤں گا۔' بی بی جان نے طیش سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

'خُدا کی لاٹھی سے ڈر شاہ میر۔ میں جو کہہ رہی ہوں اُس پہ عمل کر پُتر۔ یہ نہ ہو کہ تم اپنی حرکتوں کی وجہ سے میری نظروں سے اتنا گر جاؤ کہ میری زبان سے پُتر کا لفظ سُننے کے بھی روادار نہ رہو۔' اُسے اُس لڑکی پہ بہت ہی قہر آنے لگا جس کی وجہ سے اُس کی ماں اُسے یوں باتیں سُنا رہی تھیں۔ صبر کے گھونٹ پیتے ہوئے اُس نے کہا۔

'ٹھیک ہے بی بی جان جیسا آپ چاہتی ہیں ویسا ہی ہو گا۔'

☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ گھر آئی تو مسز اظفر ابھی تک اُس سے ناراض ہی تھیں۔ اُنہوں نے اُس سے کوئی بات نہ کی۔ بس اُس کے گھر آتے ہی خاموشی سے کھانا لگا دیا اور خود کمرے میں جانے لگیں۔

'ماما آپ کھانا نہیں کھائیں گی کیا؟' اُنہوں نے ناراض لہجے میں بنا اُس کی طرف دیکھے جواب دیا۔

'نہیں۔ میں کھا چکی ہوں۔'

'ماما آپ کب مجھ سے یوں ناراض رہیں گی؟'

'تب تک جب تک میری بات نہیں مان لو گی۔' وہ خاموشی سے ڈائننگ ٹیبل کی کُرسی کھینچ کے بیٹھ گئی اور روٹی کا نوالہ توڑ کے منہ میں رکھا۔ مسز اظفر رُخ موڑے یوں ہی چند منٹ کھڑی رہی تھیں لیکن طویل خاموشی سے اُنہیں جواب مل چکا تھا۔ سو وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ اُس نے کھانا کھایا۔ برتن سمیٹے اور دھونے کے بعد اپنے لیے چائے کا کپ بنایا اور کمرے میں چلی گئی۔ چائے پینے کے بعد اُس کا ارادہ پڑھنے کا تھا۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ محنت کرنا چاہتی تھی۔ بیگ سے اپنا موبائل نکال کے وہ صوفے پہ بیٹھ گئی۔ چائے کو گھونٹ گھونٹ حلق سے اُتارتے وہ ساتھ میں فیس بک کے نوٹی فیکیشن دیکھنے لگی۔ اسی دوران اُس کے موبائل کی میسیج بپ بجی۔ فواز کا میسیج تھا۔ کھولا تو سامنے ہی یہ نظم جگمگا رہی تھی۔

کہہ بھی دے اب وہ سب باتیں

جو دل میں۔۔۔۔پوشیدہ ہیں

سارے روپ دکھا دے مجھ کو

جواب تک۔۔۔نادیدہ ہیں

اک ہی رات کے تارے ہیں

ہم دونوں اُس کو جانتے ہیں

دوری اور مجبوری کیا ہے؟

اُس کو بھی۔۔۔پہچانتے ہیں

کیوں پھر دونوں مل نہیں سکتے؟

کیوں یہ بندھن۔۔ٹوٹا ہے؟

یا کوئی کھوٹ ہے تیرے دل میں

یا میرا غم۔۔۔۔۔۔جھوٹا ہے؟

(مُنیر نیازی)

پڑھنے کے بعد اُس نے خاموشی سے موبائل سوئچ آف کر کے سائیڈ پہ رکھ دیا۔ اور خاموشی سے چائے ختم کرنے لگی۔ وہ اب اُسے اپنے دل و دماغ پہ حاوی نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ وہ کلاس فیلو تھا تو وہ اُس سے صرف کلاس فیلو کا ہی رشتہ رکھنا چاہتی تھی۔ نہ ہی دوست اور نہ ہی حریف۔ وہ اُس کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ یہ بھی نہیں جاننا چاہتی تھی کہ وہ اُس کے بارے میں کیا سوچتا ہے؟ محبت کرتا ہے یا نفرت۔ دوستی کرنا چاہ رہا ہے یا بدلہ لینا چاہ رہا ہے۔ وہ اس سب سے کوئی غرض نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بابا جان کے کمرے سے باہر آتے ہی اُس نے گُل خان کا نمبر ملایا۔ گُل خان نے فون اُٹھاتے ہی کہا۔

'جی چھوٹے صاحب؟'

'اُس لڑکی کے ڈرامے ختم ہوئے یا نہیں؟'

'کیا مطلب؟'

'جاہل۔ مطلب یہ کہ اُس لڑکی کو ہوش آیا یا نہیں؟'

'ہوش تو آ گیا ہے چھوٹے صاحب۔ لیکن وہ تب سے روتا جا رہا ہے۔'

'کیوں کیا تکلیف ہے اُسے وہاں؟'

'کہتا ہے کہ اُس کے گھر سے اُس کی اماں کا پتہ کروا دو میرے دل کو کچھ ہوتا ہے لگتا ہے کہ وہ ٹھیک نہیں

ہے۔' جانے اُس کے دل میں کیا آئی کہ اُس نے کہہ دیا۔

'میری اُس سے بات کرواؤ اُسے بولو مجھے اپنے گھر کا ایڈریس بتائے۔' گُل خان یہ سُنتے ہی اُس کے کمرے کی طرف بھاگا۔ اُسے موبائل دیتے ہوئے کہا۔

'میں نے چھوٹے صاب سے بات کیا ہے۔ اُن کو اپنے گھر کا ایڈریس بتاؤ۔ وہ تمہارا اماں کا پتہ کریں گے۔' یہ سُنتے ہی اُس نے فوراً موبائل کان سے لگاتے ہوئے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔

'ہیلو۔۔۔کون؟'

اُس کے بھیگے لہجے اور ہچکی لے کے کہے گئے یہ دو لفظ سُن کے ہی شاہ میر کو زندگی میں پہلی دفعہ ہلکا سا احساس ہوا کہ اُس سے غلطی ہو گئی ہے۔

'میں۔۔۔شاہ میر ہوں۔'

'شاہ میر۔۔۔پلیز میری والدہ کا پتہ کروا دو۔ پتہ کروا دو کہ وہ بد نصیب ماں زندگی کا یہ آخری وار سہہ بھی پائی ہے یا نہیں؟' اتنا کہہ کے وہ پھر رونے لگی۔

'پلیز رو نہیں۔ مجھے اپنے گھر کا ایڈریس بتاؤ شہر جانے میں مجھے دو گھنٹے لگیں گے۔ میں تین گھنٹے کے اندر اندر تمہیں تمہاری ماں کے بارے میں پتہ کر کے بتا دوں گا۔ بلکہ تمہاری اُن سے بات بھی کروا دوں گا۔ اور اگلے تین سے چار دن میں تم اُن کے پاس ہو گی۔ یہ شاہ میر کا تم سے وعدہ ہے۔' اُس نے ایڈریس بتایا۔ اُس نے فون بند کر کے زاور کو جیپ نکالنے کے لیے کہا۔ اور وہ اُسی وقت شہر کی طرف نکل پڑے۔ ڈھائی گھنٹے کی مُسافت طے کرنے کے بعد جب وہ اُس گھر کے سامنے پہنچے تو وہاں دروازے پہ تالا لگا دکھائی دیا۔ زاور نے ساتھ والے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک دُبلی سی عورت باہر نکلی۔

'اس گھر کے لوگ کہاں گئے ہیں؟'

اُس کے سوال پہ عورت دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی۔

'کیا بتاؤں بیٹا۔ آج صبح ہی فجر کی نماز کے بعد اُس بد نصیب عورت کو محلے والے دفنا کے آئے ہیں۔'

اُس کی بات سے زاور کے لبوں کو قُفل لگ گئے۔ قُفل تو شاہ میر کے لبوں پہ بھی لگ گئے تھے۔ وہ عورت خود ہی بتانے لگی۔

'وہ عورت اور اُس کی بیٹی ہی کئی سالوں سے یہاں رہ رہے تھے۔ ابھی چار دن پہلے اُس کی بیٹی یونیورسٹی سے واپس

ہی نہیں آئی۔ بھاگ گئی ہو گی کسی کے ساتھ۔ہائے اُس کمبخت نے اپنی ماں کا بھی خیال نہ کیا۔ جس کی ساری زندگی کی جمع پونجی ہی صرف وہی تھی۔ یہ چار دن اُس نے بڑی تکلیف سے کاٹے ہیں۔ لیکن یہ گُزرنے والی رات خُدا نے اُس کی سُن لی۔ اور اُسے تکلیف سے نجات دے دی۔'

اتنا سُن کے ہی وہ بنا کچھ کہے وہاں سے چل پڑا۔اُس کے پیچھے زاور بھی۔ زاور ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھنے لگا لیکن شاہ میر نے اُسے منع کرتے ہوئے خود ہی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اور ڈرائیو کرنے لگا۔

زندگی میں اُس نے کئی لوگوں کو مروایا تھا لیکن اُسے کبھی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ کبھی افسوس نہیں ہوا تھا۔ لیکن آج شاید بی بی جان کی باتوں کا اثر تھا یا فون پہ سُنی گئی اُن ہچکیوں کا۔۔۔ کہ وہ خود کو 'مجرم' تصور کر رہا تھا۔اور ایسا بھی پہلی بار ہی ہوا تھا کہ اس سب میں اُس کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ کیونکہ وہ اُس کی نہیں بلکہ اُس کے ملازموں کی غلطی سے اغوا ہوئی تھی۔ اُس میں خواب نگر جا کے اُس کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔نہ ہی اس دفعہ شاہ میر کی کُل جائیداد ملا کے بھی اتنی حیثیت تھی کہ وہ کسی سے کیا گیا 'وعدہ' پورا کر سکے۔ حویلی کے گیٹ پہ جیپ روک کے وہ جیپ سے نیچے نہ اُتر سکا۔ خواب نگر جا کے اُس لڑکی سے سامنا کرنے سے بھی مشکل ترین کام اُسے اس وقت بی بی جان کے سوالوں کا جواب دینا لگ رہا تھا۔

اُس نے زاور کی طرف دیکھا جو جیپ رُکتے ہی نیچے اُتر گیا تھا اب اُس کے سامنے کھڑا اُس کے حکم کا منتظر تھا۔

'زاور کسی کو بھی اس بات کی خبر نہیں ہونی چاہیئے۔ بابا جان اور بی بی جان کو اس معاملے کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیئے۔ اگر کوئی پوچھے میں کہاں ہوں؟ تو کہنا تمہیں نہیں معلوم۔'

اُس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

'جو حکم۔'

☆☆☆☆☆☆☆☆

آج وہ اکیڈمی سے جلدی فری ہو گئی۔ گھر جانے کی بجائے وہ یونیورسٹی ہی آ گئی۔ اور لائبریری جا کے بیٹھ کے پڑھنے لگی۔ ابھی اُسے وہاں بیٹھے دس منٹ ہی گُزرے ہوں گے جب فواز اُس کے سامنے آ کے بیٹھ گیا۔ وہ اپنے نوٹس سمیٹ کے وہاں سے اُٹھ کے جانے لگی۔ جب فواز نے اُس کا ہاتھ تھام کے اُسے روک لیا۔ وہ اُس کی اس جرات پہ ہی دنگ رہ گئی۔ وہ لائبریری میں بول کے اس وقت اپنا تماشا نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اس لیے خاموشی سے بیٹھ گئی۔

اُس کے بیٹھتے ہی فواز نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

'کیسی ہو آنیہ؟'

اُس نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

'میں ٹھیک نہیں ہوں۔'

بہت پریشانی سے پوچھا گیا۔

'کیوں؟ کیا ہوا ہے؟'

'تمہارا چہرہ دیکھ لیا ہے نا۔۔۔ تو ٹھیک کیسے رہ سکتی ہوں؟'

'کیوں میرے چہرے پہ ایسا کیا ہے؟'

'زہر۔۔۔ زہر ہے تمہارے چہرے پہ۔۔۔ جب جب میں تمہیں دیکھتی ہوں یہ زہر میری آنکھوں کے ذریعے اپنے جسم میں اترتا محسوس ہوتا ہے۔۔۔ مجھے ایسے لگتا ہے اگر میں نے کچھ دن مسلسل تمہارا چہرہ دیکھ لیا۔۔ تو اس زہر کی مقدار اتنی زیادہ ہو جائے گی کہ جس سے میری سانسیں ہی ختم ہو جائیں گی۔ اس لیے میں دُعائیں مانگتی ہوں کہ میرا تم سے سامنا نہ ہوا کرے۔'

'تو پھر۔۔۔۔ یہ نہیں بلکہ یہ دُعا مانگا کرو کہ فواز کی سانسیں ختم ہو جائیں۔۔۔ کیونکہ جب تک میں زندہ ہوں ۔۔۔ میری جان۔۔۔ تم سے سامنا تو ہوتا ہی رہے گا۔'

'گویا تم میری جان لے کے ہی چھوڑو گے۔۔۔ میری چھٹی حس جیت گئی۔۔۔ جو مجھے کب سے یہی کہہ رہی تھی کہ آنیہ اظفر۔۔۔ فواز داؤد۔۔ تمہاری جان لے کے ہی چھوڑے گا۔'

'فی الحال تو میں تمہیں کچھ بتانے آیا ہوں۔'

'کیا؟'

'یہی کہ میں نے تمہارا نام اپنے گروپ میں لکھ دیا ہے اس لیے پلیز کلاس میں کوئی ہنگامہ نہ کرنا۔'

'کوئی زبردستی ہے کیا؟ تم لکھ کے تو دکھاؤ۔'

'تمہیں سُننے میں غلطی ہوئی ہے آنیہ۔۔۔ میں نے کہا ہے میں لکھ چکا ہوں۔'

اتنا کہہ کے اپنی واسکٹ کی جیب سے ایک تہہ کیا ہوا پیپر نکال کے اُس کے سامنے رکھا۔

'یہ رہی گروپ کی لسٹ۔۔۔ تم اسے کھول کے دیکھ سکتی ہو۔'

اُس نے کھول کے دیکھا اور پہلا گروپ ہی فواز کا تھا جس میں اُس کا نام فواز کے نام کے نیچے ہی جگمگا رہا تھا۔ آنیہ

نے وہ کاغذ پھاڑ دیا۔

'چلو اچھا ہی ہوا پھاڑ دیا۔۔ کیونکہ یہ تو رف تھا۔۔ فائنل تو میں دے آیا ہوں۔۔۔ پرنٹ ہونے کے لیے۔۔ کلاس شروع ہونے سے پہلے ہی گروپ کی لسٹ کلاس کی دیوار پہ لگ جائے گی۔'

'میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تم اتنے گھٹیا ہو سکتے ہو۔'

'محبت کرنے والے اگر گھٹیا ہوتے ہیں تو ہاں میں ہوں گھٹیا۔'

'یہاں سے جانے کی کیا قیمت لو گے ؟'

'رہنے دو۔۔۔ قیمت کی بات نہ کرو آنیہ۔۔ وہ قمت تم ادا نہیں کر سکو گی۔'

'تم قیمت بتاؤ۔۔۔'

'ادا کر سکو گی ؟'

'ہاں۔۔ بتاؤ تم قیمت۔۔۔ میں بھی تو جان سکوں ایسی کون سی قیمت ہے جو میں ادا نہ کر سکوں۔'

'سوچ لو آنیہ اظفر۔۔۔ اگر میں نے قیمت بتا دی تو پھر ہر حال میں چکانی پڑے گی۔'

دونوں بازو میز پہ رکھتے آگے ہو کے اُس کی آنکھوں میں جھانک کے کہا۔

'تم قیمت بتاؤ مسٹر فواز داؤد۔'

وہ چند ثانیے اُسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

'تمہاری دوستی۔'

میز سے اپنے دونوں بازو ہٹاتے وہ پیچھے ہو کے بیٹھ گئی۔

'کیا ہوا؟ کہا تھا نا نہیں چکا پاؤ گی۔'

آنیہ نے اپنا دوستی کا ہاتھ اُس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

'ایسا کبھی ہوا ہے کہ آنیہ کوئی قیمت ادا نہ کر سکے ؟'

فواز نے بہت محبت سے اُس کا بڑھایا ہوا ہاتھ تھام کے گرمجوشی سے دبایا تھا۔

'ایسا کبھی ہوا ہے کہ فواز جو چاہے وہ پا نہ سکے ؟'

'میرے خیال سے کلاس کا وقت ہونے والا ہے۔ کلاس میں چلنا چاہیئے۔'

اُس نے اُٹھتے ہوئے مُسکرا کے کہا۔

'آؤ چلیں۔'

وہ دونوں ایک ساتھ قدم اُٹھاتے آگے بڑھنے لگے۔ جب وہ یونیورسٹی کے گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو فواز نے اُسے پُکارا۔

'آنیہ۔۔۔؟'

آنیہ نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

'تھینک یو۔'

وہ مُسکرا دی۔ اُس کی ایسی مُسکراہٹ ایسی تھی کہ فواز داؤد چاہ کہ بھی اُس مُسکراہٹ کا مطلب نہیں جان سکا تھا۔ اُنہیں ایک ساتھ آتے اور مُسکرا کے باتیں کرتے دیکھ کے کاریڈور میں کھڑے علی اور حمزہ دونوں حیران ہو گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

میرو نے اُس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ کسلمندی سے آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی۔

'آجاؤ میرو۔ دروازہ کھلا ہے'

میرو نے اندر داخل ہو کے کہا۔

'گُڈ مورننگ سویٹ ہارٹ۔'

'گُڈ مورننگ۔'

'بتاؤ کیا خبر لائے ہو؟'

'تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں خبر لایا ہوں؟'

'کیونکہ بنا خبر کے تم کبھی یوں صبح صبح آ کے میرے کمرے کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے ہو۔'

'شہروز بھائی آ گئے ہیں۔'

اُس نے کوئی جواب نہ دیا اسی طرح لیٹی رہی۔

'بابا نے بولا ہے دس منٹ میں سب ڈائننگ ٹیبل پہ آئیں۔ کیونکہ سب ایک ساتھ ناشتہ کریں گے۔'

وہ اُسی وقت اُٹھتے ہوئے بولی۔

'ٹھیک ہے تم جاؤ۔ میں آ رہی ہوں۔'

وہ چلا گیا۔ اور وہ پورے دس منٹ میں ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھی۔ شہروز بھی اُسی وقت وہاں آیا تھا۔ کُرسی کھینچ

کے وہاں بیٹھتے ہوئے بولا۔

'السلامُ علیکم زے۔'

مُسکراتے ہوئے کہا۔

'وعلیکم السلام۔۔۔کیسے ہو شہروز؟'

'میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟'

وہ جواب دینے ہی لگی تھی کہ بابا اور ماما کے آجانے پہ وہ خاموش ہوگئی۔اور پھر آہستگی سے کہا۔

'میں بھی ٹھیک ہوں۔'

'شہروز بیٹا کیسا رہا سفر؟'

'سفر بہت اچھا رہا انکل۔میں نے انجوائے کیا۔'

اُنہوں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

'یہ تو اچھی بات ہے۔'

ناشتہ کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کچھ دیر بعد میرو۔۔۔شہروز کو اپنے ساتھ لیے اُس کے کمرے میں موجود تھا۔

'علیزے۔۔۔شہروز بھائی تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔اگر تم اجازت دو تو۔۔۔'

اُس نے اپنا موبائل سائیڈ پہ رکھتے ہوئے کہا۔

'ضرور کریں۔۔۔موسٹ ویلکم۔۔'

میرو۔۔واپس مُڑتے ہوئے شہروز کو آنکھ مار کے بنا آواز ہونٹوں کی حرکت سے 'بیسٹ آف لک' بول کے اُس کے کمرے سے باہر چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد شہروز اُس کے سامنے صوفے پہ بیٹھ گیا۔

'زے۔۔میں ادھر اُدھر کی باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے وہ بات کروں گا۔۔جو کرنے کے لیے میں خاص طور پہ پاکستان آیا ہوں۔۔۔زے۔۔۔تم اچھی طرح جانتی تھی کہ میں اپنی کلاس فیلو سے محبت کرتا ہوں۔۔۔لیکن اس کے باوجود تم نے یہ دعویٰ کیا کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔۔۔اور ہر حال میں مجھ سے ہی شادی کرنی ہے۔۔۔گویا میں تمہیں کسی بھی قیمت پہ۔۔ہر حال میں۔۔چاہیئے تھا۔۔مجھے اُس وقت تم پہ بہت ذیادہ غصہ آیا تھا اتنا غصہ کہ میرا دل کیا

میں تمہاری جان لے لوں۔۔۔ انکل نے جب تمہاری ضد دیکھتے ہوئے بابا سے بات کی۔۔۔ اور بابا نے مجھ سے۔۔ تو میں بابا کو انکار نہیں کر سکا تھا۔۔ کیونکہ میری اور ماہم کی محبت کے بارے میں میرے گھر والوں کے ساتھ۔۔ تمہارے گھر والے بھی بہت اچھی طرح جانتے تھے۔۔ لیکن اس کے باوجود انکل کا میرے بابا سے بات کرنا۔۔ اور بابا کا مجھ سے۔۔ تب یقین مانو مجھ میں نہ اتنی ہمت تھی اور نہ ہی اتنا حوصلہ کہ میں اپنے بابا کا وہ مان توڑ سکوں جو اُن کا مجھ پہ تھا۔۔ اور انکل کا وہ مان جو اُن کا میرے بابا پہ تھا۔۔ اس لیے میں تم سے رشتہ جوڑنے پر راضی ہو گیا۔۔۔

جب تمہارے نام کی انگوٹھی اپنی اُنگلی پہ پہنی تھی تب ہی وہ رشتہ بُھلا نے لگا۔۔ جو میرے دل نے بنایا تھا۔۔ اور وہ رشتہ یاد رکھنے لگا جو میرے بڑوں نے تمہارے ساتھ بنایا تھا۔۔ اب یاد رکھتے رکھتے۔۔ تمہارے رشتہ ایسا یاد ہو گیا ہے۔۔ لگتا ہے ساری عمر نہیں بھُولے گا۔۔'

اتنا کہہ کے وہ اُٹھتے ہوئے اُس کے قریب گیا۔۔ اور اُسے کندھوں سے تھام کے اُٹھایا۔

علیزے میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ سر اُٹھا کے اُس کی طرف ہی دیکھ سکے۔۔ آنکھوں میں دیکھنا تو دور کی بات تھی۔

'اور اب میرے دل و دماغ کو اپنا وجود اتنی اچھی طرح یاد کروا کے مجھے کہہ رہی ہو کہ تمہارا دل مجھ سے شادی کرنے پہ نہیں مان رہا؟ اب تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی؟؟؟'

وہ کچھ نہ بولی۔۔۔

'بتاؤ علیزے۔۔ کیوں کھیلا میرے ساتھ یہ سارا ڈرامہ؟؟؟ میں کوئی کھلونا نہیں ہوں۔۔۔ جو تمہیں جب اچھا لگا تم نے خرید لیا۔۔ اور جب اُس کھلونے سے دل بھر گیا۔۔ تو اُسے پھینکنے کی بات کر رہی ہو؟؟؟ لیکن یاد رکھنا علیزے میں تمہیں خود کو پھینکنے کی اجازت کبھی نہیں دوں گا۔۔'

شہروز نے اُسے جھٹکا دے کے ایسے غصے سے کہا تھا کہ وہ سہم گئی۔۔۔

اتنا سہم گئی کہ آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔۔۔

وہ اُسے دوبارہ جھٹکا دے کے باہر نکل گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ سارا دن اُس نے گُل خان کا موبائل فون دیکھتے ہی گُزار دیا لیکن اُس کا فون نہیں آیا تھا۔ جس نے تین گھنٹوں تک اُسے اطلاع دینے کا وعدہ کیا تھا۔ رات کا وقت ہو چکا تھا وہ گلاس وال کے آگے پردے کر کے کمرے میں ہی پریشانی

سے ٹہلنے لگی۔ تبھی اُس کی نگاہ اُس دیوار پہ پڑی جہاں پینٹنگز کے درمیان ایک وجاہت سے بھرپور مرد کی تصویر جگمگا رہی تھی۔ چہرے پہ غصہ ورُعب کا پہرہ۔ مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا ہاتھ۔ اور اُس بازو میں چمکتی قیمتی گھڑی۔

گُل خان اُس کے لیے کھانا لے کے آیا۔

'بی بی صاب کھانا کھالو۔'

'رکھ دو گُل خان۔ میں کھالوں گی۔'

جب وہ کھانا رکھ کے جانے لگا تو اُس نے اُسے آواز دی۔

'گُل خان؟'

'جی بی بی صاب؟'

'یہ کس کی تصویر ہے؟'

وہ ابھی بھی اُس تصویر کے سامنے کھڑی تھی۔ اور اُس کی نظریں عین اُس کی آنکھوں پہ تھیں۔ اس لیے گُل خان سمجھ گیا وہ کس تصویر کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔

'یہ تو چھوٹے صاب کا ہے۔'

'چھوٹے صاب؟ شاہ میر؟'

'جی بی بی صاب۔'

'اچھا ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔'

اگلے دن جب وہ ناشتہ لے کے آیا تو اُس نے دیکھا رات کا کھانا ویسے کا ویسے ہی پڑا ہوا تھا۔ اور وہ بیڈ پہ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ کے اُن میں سر دیئے بیٹھی ہوئی تھی جب گُل خان نے گلاس وال سے پردے ہٹاتے ہوئے اُسے پکارا۔

'بی بی صاب تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟'

اُس نے سر اُٹھایا۔ اُس کی آنکھیں بے تحاشا سوجھی ہوئی تھیں۔

'میرا دل نہیں کر رہا تھا۔ بابا کدھر ہیں؟'

'وہ کل اُن کا پاؤں پھسل گیا تھا۔ اس لیے میں نے اُنہیں آرام کرنے کا بولا تھا۔'

'اُس کا فون تو نہیں آیا؟'

'کس کا فون بی بی صاب؟'

'تمہارے چھوٹے صاب کا۔'

'نہیں بی بی صاب کوئی فون نہیں آیا۔'

'ٹھیک ہے تم جاؤ۔ اور میرے لیے کھانا لے کے نہ آنا اب۔ جب مجھے بھوک لگے گی میں خود ہی نیچے آ جاؤں گی۔'

'ٹھیک ہے بی بی صاب۔'

وہ رات والے کھانے کے برتن اُٹھا کے چلا گیا۔ صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ شام کے سائے گہرے ہوتے دیکھ کے وہ اُٹھی اور گلاس وال کے آگے پردے کر دیئے۔ اُس کی حالت یوں ہو گئی تھی جیسے کسی کی ساری دُنیا ہی لُٹ گئی ہو۔ دو دن سے اُسے کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ اُس کی دُنیا ہی تو لٹ گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا وہ انجان ہوتے ہوئے بھی انجان نہیں ہے۔ وہ دھیرے دھیرے چلتے منہ ہاتھ دھونے گئی۔ تو آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھا۔

اُسی جھوٹے، مکار، وعدہ خلاف شخص کا سوٹ پہنے ہوئے تھی۔ جب کے اُس کے اپنے سوٹ کا دوپٹہ اُس کے بائیں بازو پہ لٹک رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ سُوجھی ہوئی آنکھوں میں سُرخ ڈورے تھے۔ اس کے علاوہ ہر جذبے سے عاری وہ مُردہ آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہونٹ یوں خشک ہوئے تھے جیسے صحرا میں بھٹکتا انسان صدیوں سے پیاسا ہو۔۔ پانی کے ایک قطرے کے لیے ترس رہے ہوں۔ وہ نل کھول کے پانی کے چھینٹے منہ پہ مارتی رہی۔ اپنے دوپٹے سے ہی اپنا چہرہ خشک کیا اور واش روم کا جوتا سائیڈ پہ اُتار کے وہ کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں آتے ہی اُس کی تصویر پھر نظروں سے ٹکرا گئی۔ وہ پھر کئی ثانیے اُس تصویر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔

یک دم وہ پلٹی۔۔۔۔

میز پہ پانی کے جگ کے ساتھ رکھا شیشے کا خالی گلاس اُٹھا کے اُس نے ٹھاہ اُس کی تصویر پہ دے مارا۔ چھناک کی آواز سے شیشہ ٹوٹ کے زمین پہ گرا تھا۔ لیکن اُس کی تصویر کا پوسٹر صحیح سلامت فریم میں اٹکا رہا۔

واسکٹ اپنے بازو پہ ڈالے وہ تھکا ہارا لا علمی میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اپنے کمرے میں قدم رکھتے ہی یہ بے درد منظر اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ آج تک اُسے کسی نے پیار کی چھڑی سے بھی نہیں مارا تھا۔ اور کہاں شیشے کا گلاس اُٹھا کے نفرت کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کے ساتھ اُس کی تصویر پہ مارا گیا تھا۔ وہ اُس تصویر پہ نہیں اُس کے سینے پہ لگا تھا۔ اور اُس کا وجود شیشے کی طرح چکنا چور ہو کے اُس کے اپنے ہی قدموں میں آ گرا تھا۔ وہ زمین پہ گرا شیشہ تو کوئی

ملازم آ کے وہاں سے سمیٹ لے جائے گا۔

لیکن۔۔۔۔

اُس کا ٹوٹا ہوا وجود اب کون سمیٹے گا۔۔۔۔؟؟؟

وہ نیچے جھکی اور شیشے کا ایک ٹکڑا اُٹھا کے اپنی نبض کا نشانہ لینے لگی۔ اُس کا ارادہ بھانپتے ہوئے شاہ میر فوراً اُس کی طرف بڑھا۔ اور اُس کے وجود کو بازو کے گھیرے میں لیتے دوسرے ہاتھ سے وہ شیشے کا ٹکڑا اُس کے ہاتھ سے نکالنے لگا۔ جسے وہ چھوڑنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ اپنا بازو اُس کے وجود سے ہٹاتے وہ احتیاط سے اُس کی اُنگلیوں کو شیشے کے ٹکڑے سے ہٹانے لگا۔ اُس نے وہ بے دردی سے اُسی کی ہتھیلی پہ رگڑ ڈالا۔

اُس کے لبوں سے بے اختیار 'آہ' کی آواز نکلی تھی۔ وہ اُسے چھوڑ کے اپنا ہاتھ تھامے وہیں صوفے پہ بیٹھ گیا۔ خون بھل بھل کر کے اُس کی ہتھیلی سے نکلنے لگا۔ اور وہ اُس کی ہتھیلی سے نکلتا خون دیکھ کے حواس باختہ ہو گئی۔ شاہ میر نے سر اُٹھا کے اپنی غصے سے سُرخ ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

وہ ڈر گئی۔۔۔۔

ڈرتے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹی تھی اور اسی چکر میں اُس کے دونوں پاؤں کانچ کے ٹکڑوں پہ۔۔۔۔ اُس کے لبوں سے ایک دم ہی چیخ نکلی تھی۔ اور وہ اپنی تکلیف بھول کے فوراً اُس کی طرف بڑھا۔ اُسے اُٹھا کے

بیڈ پہ بٹھایا۔ اُس کے پاؤں سے کانچ نکالے اور اپنی الماری سے مرہم پٹی کا سامان نکال کے گھٹنوں کے بل زمین پہ بیٹھ کے اُس کے پاؤں پہ مرہم لگانے لگا۔۔۔ لیکن اُس نے اپنے دونوں پاؤں پیچھے کر لیے۔۔۔

اُس کی یہ حرکت اُس کے غصے کو طیش دلا گئی۔۔۔

اتنے نخرے تو اُس نے کبھی خود کے نہیں برداشت کیے تھے۔۔

اُس کا ہاتھ اُس کے بائیں گال پہ اپنا نشان ثبت کر گیا۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

باقی آئندہ

اس قسط پر آپکی قیمتی رائے کا انتظار رہے گا۔۔